

مارچ ۱۹۶۵ء — رجسٹرڈ ایس نمبر ۱۹۰۳

تیسرا شمارہ — ہمدرد نونہال — بارھویں جلد

اس رسالے میں کیا ہے؟

جاگو، جگاؤ	۱	حکیم محمد سعید
موچی (نظم)	۲	خواجہ الطاف حسین حالی
ایک کارآمد شرارت	۳	عشرت رحمانی
ایک بڑے رہنما کی سچی کہانی	۷	......
حرکت میں برکت	۹	عبدالصمد صارم
برف کے پھول	۱۱	عبداللہ خاور
پہیلی (نظم)	۱۵	جبریل صدیقی
پال بنیان کی جناتی گھڑی	۱۷	......
بچوں کا طرحی مشاعرہ (۲)	۲۵	صوفی غلام مصطفےٰ تبسم
اغوا (۲)	۲۸	علی اسد
باغ کے رکھوالے نے کبھی پھل نہیں کھایا	۴۱	عشرت رحمانی
اوسان	۴۳	محمد عبداللہ خاں
بڑھیا جو شہر سے خوف زدہ تھی	۴۵	حکیم سید عطاءالرحمٰن عمر
اخبار نونہال	۴۹	ادارہ
عقل مند کسان	۶۵	......
تار برقی کے موجد	۶۹	......
تصویر بنائی (نظم)	۷۳	ظہیر ریاض
چالیس بھائی	۷۴	......
ابن رشد	۷۷	کوثر چاند پوری
انعام	۸۱	فہمیدہ اختر
مختلف ملکوں کے مکانات	۸۵	علی ناصر زیدی
میں نے آپ کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتی	۸۷	توقیر
عقل مند کون	۹۱	رزاق محمود
دو چاند	۹۳	......
کچھ کہو، کچھ سنو	۹۵	مسعود احمد برکاتی
نونہال ادیب	۹۷	نونہالان پاک
تمھارا خیال ہے	۱۰۵	نونہالان پاک
حلقۂ دوستی	۱۰۸	ادارہ
ان الفاظ کے معنی کیا ہیں؟	۱۱۲	ادارہ

قیمت: ایک رسالہ ۷۵ پیسے — سالانہ آٹھ رُپے

مارچ ۱۹۶۵ء

مدیر اعلا: حکیم محمد سعید

مدیر معاون: مسعود احمد برکاتی

فون: ۴۷۷۷۵

شمارہ ۳ جلد ۱۲

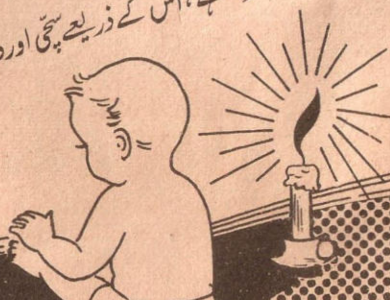
دفتر ہمدرد نونہال
ہمدرد ڈاک خانہ، کراچی ۱۸

ہمدرد نونہال

جاگو، جگاؤ

دوسروں کے کام آکر اور عوام کی خدمت کر کے جو خوشی حاصل ہوتی ہے، وہ کسی دوسری طرح حاصل نہیں ہوتی۔ انسان اپنی بھلائی کے لیے جو کام کرتا ہے، وہ بھی اس کی خوشی کا باعث ہوتے ہیں، لیکن بے غرضی کے ساتھ دوسرے انسانوں کی خوشی کے لیے جو کام وہ کرتا ہے، اس کے ذریعے سچی اور دیرپا خوشی حاصل ہوتی ہے۔

حکیم محمد سعید



قیمت:— ایک رسالہ: ۷۵ پیسے —— سالانہ: آٹھ روپے



خواجہ الطاف حسین حالی کی ایک نظم

موچی



چمڑا مول منگاتا ہوں — دھو کے اسے سکھاتا ہوں
مل کر نرم بناتا ہوں — یوں چمڑے کو کماتا ہوں
میں موچی کہلاتا ہوں

پنّے وَنّے کاٹ کٹا — کرتا ہوں خوب ان کو صفا
پھرے پتّا اور تلا — سیتا ہوں دونوں کو ملا
یوں کام اپنا بناتا ہوں

پھر جوتی قالب پہ چڑھا — ٹھونک ٹھکا اور کوٹ کٹا
رانپی سے بُرشا کے تلا — سیتا ہوں دونوں کو ملا
پھر کام اور لگاتا ہوں

اوروں کیسی یہاں نہیں لوٹ — جانیو میری بات نہ جھوٹ
سال کے اندر میرا بوٹ — میں ضامن جو جائے ٹوٹ
اس کی شرط لگاتا ہوں

بابو ہو یا ہو لالا — گورا ہو یا ہو کالا
بوڑھا ہو یا ہو بالا — ادنیٰ ہو یا ہو اعلا
سب کا حکم بجاتا ہوں



ایک چینی کہانی

ایک کارآمد شرارت



بہت عرصہ ہوا ملک چین میں ایک غریب مصوّر چیانگ چی رہتا تھا۔ اس کی بیوی اور دو بچّے تھے۔ بڑے لڑکے کا نام اِہ می تھا اور اس سے چھوٹی لڑکی کا نام تنگ سیانگ تھا۔

چیانگ چی لکڑی اور ہاتھی دانت پر گل بوٹے بنا کر اُن سے بہت ہی خوب صورت کھلونے بنا کر گزارہ کرتا تھا۔ اُن کے ساتھ ہی چیانگ چی کا ادیب بھائی چیانگ چا رہتا تھا۔ وہ تمام دن ایک کالے برش سے کاغذ پر کچھ نہ کچھ لکھتا ہی رہتا تھا اور جب اُس کے کاغذ ختم ہو جاتے تو وہ دیواروں پر لکھنا شروع کر دیتا۔ اس طرح اُن کے گھر کی دیواریں اور چھتیں عجیب و غریب لفظوں سے بھری پڑی تھیں۔ اُن کے پڑوسیوں اور رشتہ داروں کا خیال تھا کہ چیانگ چا کی شاعری وغیرہ کسی کام کی نہیں، کیوں کہ اس سے اُسے کوئی پیسہ ویسہ تو ملتا نہیں اور وہ خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔ اُن کی یہ رائے تھی بھی درست، کیوں کہ چیانگ چا جو کچھ بھی لکھتا اس کے پاس اس کی ایک ہی کاپی ہوتی، جو کوئی امیر آدمی تھوڑے سے پیسے دے کر خرید لیتا، جس سے چیانگ چا کے کاغذ، برش اور رنگوں کے خرچ بھی مشکل ہی سے پورے ہوتے۔ ویسے تو چیانگ چی کو بھی

اتنی محنت کرنے کے بعد اتنے کم پیسے ملتے تھے، جن سے وہ بمشکل اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ پال سکتا۔ اسے اپنے کام میں اتنی مہارت تھی کہ وہ ہاتھی دانت کے ایک مربع انچ ٹکڑے پر سات چکر بنا سکتا تھا۔ چیانگ چی کو اپنے بیٹے اہ می سے بہت ہی پیار تھا اور وہ اُسے بہت خوب صورت کھلونے بنا بنا کر دیتا، مگر اہ می اتنا شریر لڑکا تھا کہ وہ تھوڑی دیر میں ہی کھلونے دیوار پر مار مار کر توڑ دیتا یا باہر پھینک دیتا۔

ایک دفعہ چیانگ چی نے بڑی محنت کے بعد ایک بہت ہی خوب صورت لکڑی کا اژدھا بنایا۔ اُسے بازار میں بیچ کر وہ اچھے خاصے پیسے کما سکتا تھا، لیکن اہ می نے ضد کرکے وہ اژدھا اپنے لیے لے لیا۔ تھوڑی دیر تک اُس سے کھیلنے کے بعد اہ می کا جی بھر گیا تو اس نے حسبِ عادت کھلونا کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ چیانگ چی نے جب یہ دیکھا تو خفا ہونے کے بجائے بڑے پیار سے اہ می کو سمجھانے لگا، "دیکھو بیٹا! یہ بہت بری بات ہے، اس لیے آئندہ کبھی کھلونے کھڑکی سے باہر پھینکنے کی حرکت نہ کرنا۔" اتنا کہہ کر چی تو کوئی نیا کھلونا بنانے میں مشغول ہو گیا اور اہ می لکڑی کے ٹکڑے اوپر تلے رکھ کر مینار بنانے لگا، جیسے ہی اہ می آخری ٹکڑا لگاتا سب ٹکڑے دھڑام سے گر پڑتے۔ اب تو اہ می کو بہت غصہ آیا۔ اُس نے آخری ٹکڑا اٹھا کر زور سے دروازے سے باہر پھینک دیا۔ چیانگ چی یہ دیکھ کر غصے سے بولا، "اہ می میں نے تمھیں ایک بار منع کیا تھا اور تم نے پھر وہی حرکت کی۔" مگر اہ می بے چارے کا کیا قصور تھا۔ وہ کہنے لگا، ابا جان، آپ نے تو کھڑکی سے باہر پھینکنے کو منع کیا تھا۔ دروازے سے باہر پھینکنے کو تو منع نہیں کیا تھا۔" ابھی چیانگ چی اہ می کو سزا دینے کے لیے اٹھا ہی تھا کہ دروازہ کھلا اور بہت سے سپاہی نیزے پکڑے اندر گھس آئے اور چیانگ چی کو گرفتار کرتے ہوئے بولے، تم نے شہنشاہ پر قاتلانہ حملے کی کوشش کی، اس لیے تمھیں گرفتار کیا جاتا ہے۔" ہُوا یوں کہ جب اہ می نے لکڑی کا ٹکڑا دروازے سے باہر پھینکا اُسی وقت وہاں سے شہنشاہ چین کی سواری گزر رہی تھی وہ لکڑی کا ٹکڑا شاہی پالکی کی کھڑکی کو جا لگا۔ بے چارہ چیانگ چی یوں ہی پکڑا گیا، مگر اب کیا ہو سکتا تھا، سپاہی اُسے بادشاہ سلامت کے سامنے لے گئے اور ساتھ ہی گواہی کے لیے وہ ٹکڑا بھی اُن کی خدمت میں پیش کیا، جس سے اُنھیں مارنے کی

کوشش کی گئی تھی۔ ٹکڑا ہاتھ میں لیتے ہی شہنشاہ کا غصہ ایک دم اتر گیا۔ انھوں نے ایسی خوب صورت گل کاری کبھی نہیں دیکھی تھی۔ انھوں نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ چیانگ چی کو مع خاندان نہایت عزت و احترام سے محل کے ساتھ والے عالی شان مکان میں پہنچا دیا جائے، کیوں کہ آج سے اُسے شاہی کاری گر مقرر کیا جاتا ہے۔

بس پھر کیا تھا، چیانگ چی کے مزے ہو گئے۔ اب تو وہ ہر وقت لال بٹن والی ٹوپی پہنے رہتا۔ اُس زمانے میں لال ٹوپی پہننے کا مطلب یہ ہوا کرتا تھا کہ اس شخص پر شہنشاہ کی خاص عنایت ہے۔

اہ می بھی دن رات جام کھا کھا کر بیمار ہو گیا۔ شاہی حکیم صاحب اس کے علاج کو آئے اور انھوں نے چیانگ چی کو ہدایت کی کہ اب اہ می کو جام کے مرتبان کو ہاتھ بھی نہ لگانے دیا جائے۔

شہنشاہ کے دربار میں جانے سے پہلے چیانگ چی اہ می کو تاکید کر گیا کہ اپنی بہن کی چٹیا کھینچ لینا، زیادہ شرارت کو جی چاہے تو تھوڑی توڑ پھوڑ کر لینا، مگر جام کے مرتبان میں نہ گھسنا۔ چیانگ چی تو یہ کہہ کر چلا گیا، مگر اہ می بے چارہ اس سوچ میں پڑ گیا کہ یہ تو ابا بھی جانتے ہیں کہ وہ اتنے سے مرتبان میں نہیں گھس سکتا پھر اس میں گھسنے کا کیا مطلب ہے۔ بہت سوچ بچار کے بعد اہ می نے اس کا یہ مطلب نکالا کہ ابا یہ کہنا چاہتے تھے کہ مرتبان میں ہاتھ نہ ڈالنا۔

اہ می بہت فرماں بردار لڑکا تھا، اس لیے اس نے مرتبان میں ہاتھ بالکل نہیں ڈالے، بلکہ دونوں کہنیوں سے مرتبان اٹھا کر نقش و نگار والے ٹکڑوں پر جام انڈیلنا شروع کیا جب سب ٹکڑے بھر گئے تو زبان سے انھیں چاٹنے لگا۔ تھوڑی دیر میں چیانگ چی بھی واپس آ گیا۔ اُسے یہ دیکھ کر بہت غصہ آیا اور اہ می کو مارنے کے بجائے اُس نے ٹکڑے اٹھا اٹھا کر اِدھر اُدھر پھینکنے شروع کر دیے۔

یہ شور و غل سُن کر اُس کا بھائی چیانگ چا اپنے کمرے سے دوڑا دوڑا آیا، جب اُس کی نظر دیوار پر پڑی، جہاں جام لگے ہونے کی وجہ سے جگہ جگہ لکڑی پر بنے ہوئے نقش کی چھاپ پڑ گئی تھی تو وہ خوشی سے اُچھل پڑا اور اہ می کو گود میں اٹھا کر پیار کرتے ہوئے بولا، "اہ می بیٹے تم نے تو بہت

شاندار ایجاد کردی۔ اب تو میں اپنے گیتوں، کہانیوں اور نظموں کی زیادہ سے زیادہ نقلیں بناکر عزت، دولت اور شہرت حاصل کرسکتا ہوں۔" چیانگ چی اور اہ می حیرت سے اُسے تکنے لگے تو چیانگ چانے انھیں بتایا کہ وہ ایک نظم دیوار پر یا کاغذ پر لکھ دیا کرے گا، چیانگ چی اُسے ہو بہو لکڑی پر کندہ کردے گا، اہ می ٹکڑوں پر رنگ برنگے جام لگائے گا اور چا اُسے بہت سے کاغذوں پر یوں لگائے گا کہ پوری نظم اُن پر چھپ جائے گی اور اس طرح کاغذ خشک ہونے پر امیر و غریب ہر قسم کے لوگ اُسے خرید سکیں گے۔ چا نے انھیں سمجھایا کہ اگر وہ خود برش سے ایک نظم کی نقلیں تیار کرنے لگے تو اتنا بہت سا وقت ضائع ہوگا اور زیادہ نقلیں بھی تیار نہ ہوسکیں گی۔ اب اُن دونوں کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور تھوڑے دنوں بعد دونوں بھائیوں نے ایک چھوٹا سا چھاپہ خانہ کھول لیا اہ می اپنے پسندیدہ کام جام لگانے میں مصروف رہنے لگا جب کام زیادہ بڑھ گیا تو ملازم رکھ لیے۔ اس طرح چیانگ چا اور چیانگ چی ملک بھر میں مشہور ہوگئے۔ چا کی نظمیں تو آج تک چین کے بچے پڑھتے ہیں اور جیسے جیسے زمانہ ترقی کرتا گیا، چھاپے خانے بھی نئی نئی شکلوں میں ڈھلتے گئے۔ کیکسٹن (CAXTON) کا چھاپہ خانہ اس کی سب سے پہلی ترقی یافتہ شکل تھا اور اب تو چھاپہ خانوں نے بے انتہا ترقی کرلی ہے۔ "ہمدرد نونہال" کس قدر خوب صورت چھپائی کے ساتھ ہر مہینے تمھارے سامنے آتا ہے۔ اس کی خوش نما چھپائی دیکھ کر جی خوش ہوجاتا ہے۔

تمھیں یقین نہ آئے

مگر یہ حقیقت ہے کہ:

★ ایک عمدہ بمبار طیارے پر جتنا خرچ آتا ہے اس سے (۱) دو لاکھ پچاس ہزار اسکول ٹیچروں کو ایک سال تک دی جاسکتی ہے (۲) سائنس کی ۳۰ فیکلٹیاں ایسی تعمیر کی جاسکتی ہیں کہ ہر ایک میں ایک ایک ہزار طالب علم ہوں۔

★ ایک ایٹمی ڈُبکنی کشتی کی جتنی قیمت ہوتی ہے، اس سے پچاس شہروں میں جدید ترین قسم کے ہسپتال قائم کیے جاسکتے ہیں۔

★ آواز کی رفتار سے تیز اڑنے والے ایک جنگی طیارے کی قیمت میں چھ لاکھ مکان ایسے بنائے جاسکتے ہیں کہ ان میں ۳۰ لاکھ سے زیادہ آدمیوں کے رہنے کی گنجائش ہو۔

★ ... ★



ایک بڑے رہ نما کی سچی کہانی

آج ہم تمھیں مسلمانوں کے ایک بہت بڑے رہ نما کی سچی کہانی سناتے ہیں۔ تم نے ان کا نام ضرور سنا ہوگا، سر سید احمد خاں۔ اصلی نام سید احمد تھا۔ ان کی لیاقت اور خدمات کی وجہ سے انھیں حکومت کی طرف سے سر کا خطاب ملا تھا۔

سید احمد خاں دہلی کے شریف خاندان میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں ان کے والد کی وفات ہوگئی۔ والد کے مرنے کے بعد ان کی والدہ اپنے بیٹے کو پہلے سے بھی زیادہ لاڈ پیار سے پالنے لگیں۔

عام طور پر ہم نے دیکھا ہے کہ گھروں میں جو نوکر جاکر کام کرتے ہیں، بچے ان کے ساتھ کھیلتے بھی ہیں۔ جب کسی بات پر ضد کرتے ہیں اور نوکر ان کی ضد پوری نہ کرے تو اس سے خفا ہوجاتے ہیں۔ یہاں تک کہ نوکر کو نا سمجھی میں مار بیٹھتے ہیں۔ سید احمد خاں کے بچپن کا واقعہ ہے کہ ایک دن وہ گھریلو نوکروں کے ساتھ گھر میں کھیل رہے تھے۔ کھیلتے کھیلتے کسی بات پر روٹھ گئے اور ایک نوکرانی کے طمانچہ مار دیا۔ ان کی والدہ نے دیکھ لیا اور ان کے پاس جاکر پہلے تو انھیں خوب ڈانٹا کہ "تمھیں اپنے سے بڑے پر ہاتھ اٹھاتے شرم نہیں آتی"، اور اس کے بعد نوکرانی سے کہا کہ اس بدتمیز لڑکے کو گھر سے باہر نکال دو۔ جسے چھوٹے بڑے کی تمیز نہ ہو، میں اسے اپنا بیٹا نہیں بناتی۔ نوکرانی نے سمجھا کہ یوں ہی لڑکے کو دھمکانے کے لیے کہا ہے۔ وہ چپ چاپ کھڑی رہی، لیکن ان بزرگ خاتون نے نوکرانی سے تاکید کی کہ میں کہتی ہوں کہ اسے گھر سے باہر نکال دو۔ تم میری بات کیوں نہیں سنتیں۔ آخر نوکرانی کو ان کا کہنا ماننا پڑا اور ننھے احمد کو دروازے کے باہر لے جاکر کھڑا کردیا۔ سردی کا موسم تھا۔ دن بھر یہ لڑکا بھوکا پیاسا باہر کھڑا رہا۔ گھر کے لوگوں اور نوکروں نے بیگم سے سفارش بھی کی کہ اب بچے کا قصور معاف کردیجیے اور گھر میں بلا لیجیے، مگر وہ نہ مانیں۔ آخر شام ہوگئی۔ بچہ سردی میں کانپتا رہا، مگر ماں نے اپنے لاڈلے کی پروا نہ کی اور جی کڑا کیے بیٹھی رہیں۔ گھر والوں نے منتیں خوشامدیں کیں۔ اس پر انھوں نے کہا کہ اس نے

جس کے ساتھ بے ہودگی کا برتاؤ کیا ہے، اس سے معافی مانگے، جب اندر بلایا جا سکتا ہے۔

اور ننھے احمد نے نوکرانی سے اپنے قصور کی معافی مانگی۔ اس کے بعد پیاری ماں نے اسے اندر آنے کی اجازت دی۔ پھر انھوں نے ماں کے سینے سے لگ کر رو رو کے اپنی غلطی کی معافی مانگی۔ ماں نے پیار کیا اور سمجھایا، "بیٹا، اچھے بچے وہ ہیں، جو بڑوں کا ادب کرتے ہیں۔ سب انسانوں سے پیار اور بھلائی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ نوکروں کو غریب سمجھ کر کبھی ان کی بے عزتی یا ان سے بدتمیزی نہیں کرتے۔"

ان باتوں کا ننھے احمد پر یہ اثر ہوا کہ وہ بڑے ہو کر ہمیشہ سب کے ساتھ نرمی اور بھلائی سے پیش آتے رہے اور بہت قابل اور لائق انسان بنے۔

جب انھوں نے اپنے حالات لکھے تو سب سے پہلے اپنے قلم سے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ انھیں اپنی لائق ماں کی تربیت پر فخر تھا، وہ اس واقعہ کو یاد کر کے خوش ہوتے تھے کہ اگر میری والدہ مجھے اس طرح نصیحت نہ کرتیں تو میں اچھی عادتیں نہ سیکھ سکتا اور میں نے اسی تربیت سے استادوں کا ادب کرنا سیکھا اور علم حاصل کر کے اس درجہ کو پہنچا۔ ورنہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد لاڈ پیار میں بگڑ کر میں کچھ بھی نہ بنتا۔

یہ وہی سید احمد خاں ہیں، جنھوں نے اپنی اعلا قابلیت کی بدولت مسلمان قوم کو نئی تعلیم سے سنوارا۔

ہندستان میں جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی حکومت نے مسلمانوں کو سخت مصیبت میں مبتلا کر رکھا تھا۔ سید احمد خاں نے ملک بھر کے مسلمانوں کی حالت درست کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ علی گڑھ میں مدرسہ کھولا، جس میں مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کے ساتھ اسلامی تعلیم دی جانے لگی۔ یہی مدرسہ ترقی کر کے کالج اور پھر دنیا میں ایک مشہور یونی ورسٹی بنا۔ سید احمد خاں کی کوششوں نے ہمارے ملک کے مسلمانوں کو نئی تعلیم سکھائی اور لائق بنایا۔ پھر ان کی قابلیت اور بڑائی کی وجہ سے انگریزی حکومت نے انھیں سر کا خطاب دیا، جو اس زمانے کا بہت بڑا خطاب مانا جاتا تھا۔ بہت لوگ ان کا پورا نام بھی نہیں جانتے، کیوں کہ وہ زیادہ تر سر سید کے نام سے مشہور ہوئے۔ اور دنیا بھر کے بڑے لوگوں میں سے ایک مانے جاتے ہیں۔

۱۸۵۷ء میں سر سید کا گھر بار لوٹ لیا گیا۔ ان کے کچھ عزیز بھی مارے گئے، لیکن وہ اپنا سارا غم بھول کر ملک اور مسلمان قوم کی بھلائی اور بہتری کے لیے رات دن کوشش میں لگے رہے۔ آخر ان کی کوششوں کے ذریعے مسلمانوں نے اپنے قدموں پر کھڑا ہونا سیکھا اور آزاد قوم بننے کے لائق ہوئے۔

سر سید کی ساری بڑائی ان کی بچپن میں نیکی اور بھلائی سیکھنے کے سبب سے ہوئی اور وہ آج سر سید اعظم کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔

عبد الصمد صارم



حرکت میں برکت

ایک امیر گھرانے کی لڑکی کام سے جی چُراتی تھی، وہ بڑی آرام طلب تھی، ہر وقت لمبی لمبی پلنگ پر پڑی رہتی۔ اس کی ماں نے سوچا، "اس طرح یہ لڑکی پڑی رہی تو بے کار ہو جائے گی، نکمی ہو کر رہ جائے گی اور اس کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔"

ایک دن ماں نے اُسے بلا کر اپنے پاس بٹھایا اور کہا، "اب تو ہر کام کر سکتی ہے، جو کام تجھے اچھا لگے کیا کر، تاکہ بچپن ہی سے تجھے کام کرنے کی عادت پڑ جائے۔" مگر لڑکی نے ماں سے معافی چاہی اور کہا، "مجھے باغ میں جانے اور سیر کرنے کی اجازت دی جائے تاکہ میں اچھے اچھے مناظرِ قدرت دیکھ سکوں۔"

ماں نے اجازت دے دی، لڑکی خوشی خوشی دوڑتی ہوئی باغ میں پہنچی۔ اُس نے وہاں ایک بڑا خوب صورت سُرخ رنگ کا پرند دیکھا۔ وہ اس سے پوچھنے لگی، "اے سُرخ پرند! کیا تجھے کوئی کام نہیں ہے؟ کیا تو صبح سے شام تک بس پیتے ہی کھاتا رہتا ہے؟"

پرند نے کہا، "کیا آپ یہ سمجھتی ہیں کہ میں کبھی کوئی کام نہیں کرتا اور یوں ہی بیکار پھرتا رہتا ہوں، میں تو ہر وقت کام میں لگا رہتا ہوں، میں کیسے بے کار بیٹھ سکتا ہوں، جبکہ میں اپنے بچّوں کو پالتا پوستا ہوں اور اُن کے لیے روزی جمع کرتا ہوں تاکہ وہ جاڑوں میں آرام سے کھا سکیں۔ آج کل میں اپنے اور اپنے بچّوں کے لیے روزی جمع کر رہا ہوں۔"

لڑکی نے جو یہ بات سنی تو بہت متاثر ہوئی۔ وہ آگے بڑھی تو اُس نے شہد کی ایک مکھی دیکھی۔ اس نے مکّھی سے پوچھا، "اے مکھی کیا تو کبھی کوئی

کام کرتی ہے؟"

مکھی نے جواب دیا، "کیوں نہیں، مجھے تو بہت کام ہیں، میں ایک پھول سے دوسرے پھول کی طرف اڑتی ہوں، سب کا رس جمع کرتی ہوں اور پھر اس سے ایک عمدہ غذا تیار کرتی ہوں۔ تم نے کبھی میری تیار کی ہوئی غذا چکھی تو ہو گی جسے شہد کہتے ہیں۔"

اس جواب سے بھی لڑکی بہت متاثر ہوئی، وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی، سر جھکائے کچھ سوچ رہی تھی کہ اس کی نظر ایک چیونٹی پر پڑی جو بڑی محنت سے کھانے کی کوئی چیز گھسیٹ رہی تھی۔

لڑکی اس سے بولی، "کیا یہ کام تھکا دینے والا نہیں ہے؟ اے چیونٹی! چھوڑ بھی، آ میرے ساتھ کھیل، طاقت سے زیادہ بوجھ اٹھاتے اٹھاتے کیوں مری جا رہی ہے؟"

چیونٹی نے کہا، "میں بہت خوش ہوں کہ میں اپنی غذا حاصل کر سکی، گو مجھے سخت تکلیف پہنچی۔ مجھے کھیل کود کی فرصت کہاں جس سے کوئی فائدہ نہ ہو۔ آج ایک سنگ دل انسان نے ہمارا گھر برباد کر دیا، مگر ہم ناامید نہیں ہوئے۔ اب ہم اس جگہ کو چھوڑ کر کہیں اور گھر بنائیں گے اور مصیبتوں پر غلبہ پاکر رہیں گے حتیٰ کہ آرام کی زندگی حاصل کر لیں۔" یہ سب کام میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں اپنے خاندان کے ساتھ کام کرنے جا رہی ہوں۔

چیونٹی کی ان باتوں سے لڑکی بہت متاثر ہوئی اور پرند، مکھی اور چیونٹی کی باتوں پر غور کرنے لگی۔ وہ جان گئی کہ زندگی کا مزہ کام ہی سے ہے۔ ساری مخلوق، انسان، حیوان اور کیڑے مکوڑے رات دن سب کام میں لگے رہتے ہیں۔

وہ اس بات پر غور کر رہی تھی کہ یہ درخت تو یقیناً کچھ بھی کام نہیں کرتے۔ اچانک اس کی نگاہ ایک پھول پر پڑی تو وہ اس سے بھی پوچھ بیٹھی، "پھول! اے خوب صورت پھول! تجھے تو کچھ بھی کام نہیں کرنا پڑتا۔"

پھول نے جواب دیا، "منی بیگم! میں تو بہت کام کرتا ہوں، میں صبح صبح سورج کی شعاعیں جمع کرتا ہوں اور انھیں اپنی پتیوں میں محفوظ کر دیتا ہوں۔ میرے سارے اجزا کام میں لگے رہتے ہیں۔ اسی طرح میرا درخت زمین سے غذا حاصل کرتا ہے اور اس کا ہر جزو کھانے پکانے اور ہضم کرنے میں مشغول رہتا ہے۔"

لڑکی یہ سُن کر خاموش ہو گئی، وہ سیدھی گھر گئی۔ اُس نے پختہ ارادہ کر لیا کہ اب وہ بھی کام کیا کرے گی، سستی کو چھوڑے گی اور چستی اختیار کرے گی۔ دوڑی دوڑی ماں کے پاس گئی، کہنے لگی، "پیاری ماں! مجھے کام کرنے کے فائدے اچھی طرح معلوم ہو گئے ہیں، اب میں جان گئی ہوں کہ حرکت میں برکت ہے۔ مجھے اب تک کاہلی میں پڑے رہنے کا افسوس ہے۔ اب جو تم حکم دو گی کروں گی، خوشی خوشی کروں گی" میری پیاری ماں!"



برف کے پھول

SAMI.65

عبداللہ خاور

قدرت ہر وقت خوب صورتی پیدا کرنے میں مصروف رہتی ہے اور اس نے جو کچھ بنایا ہے، سب انتہائی دل کش ہے۔ دریا، جھیلیں، سمندر پہاڑ، جنگلات کتنے خوب صورت ہیں۔ دن اور رات کیسے حسین ہیں۔ آفتاب کا طلوع و غروب، روشن ستارے، چاند، شفق، قوس قزح، یہ سب کتنے دل کش ہیں۔ ہمارا خالق یہ چاہتا ہے کہ ہم اپنی چند روزہ زندگی ایسے ماحول میں گزاریں، جو بہت ہی خوب صورت ہو۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ قدرت کے حسن کو ہم دیکھیں، محسوس کریں یا نظر انداز کریں۔

قدرت نے تو آندھی، طوفان، آگ، پانی اور برف کو بھی خوب صورت بنایا ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن سے ہم ڈرتے ہیں اور ان سے زندگی بھی حاصل کرتے ہیں، لیکن زندگی کے ساتھ ہمیں اُن سے دل کشی بھی نچوڑ لینا چاہیے۔

برف دُنیا میں تباہی و بربادی کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اس نے ہماری دُنیا کے ایک بہت بڑے خشک علاقے پر مستقل قبضہ جما رکھا ہے، جس پر بڑی بڑی انسانی آبادیاں اور ملک بن سکتے تھے۔ سرد ملکوں میں جب برفیلے طوفان آتے ہیں تو بڑی بربادی مچتی ہے، لیکن ان ملکوں کے لوگوں نے

برف سے مقابلہ کرنا سیکھ لیا ہے۔ اب وہ اس قوت کے جوش پر مسکراتے ہیں اور برف کے شفاف حسن کو دیکھ کر مسرور ہوتے ہیں۔

خزاں کا موسم برفباری کے زمانے میں آتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہوا انتہائی سرد ہو جاتی ہے اور سفید غبار سا چھا جاتا ہے، پھر معلوم ہوتا ہے کہ راستوں، چھتوں اور گلی کوچوں میں شفاف پسا ہوا سنگِ مرمر بچھ گیا۔ پھر دُھنکی ہوئی روئی کی طرح برف کے گالے گرنا شروع ہوتے ہیں اور آہستہ آہستہ زمین پر سخت برفیلا فرش بن جاتا ہے۔ اب تم ایسے عالم کا خیال کرو، جہاں ہر چیز سفید ہے۔ آسمان سفید، زمین سفید، راستے، گلیاں، دریا، پہاڑ، درخت سب سفید ـــــ درختوں پر جب برف گرتی ہے تو شاخوں اور پتیوں میں چمٹ جاتی ہے۔ جب تک اس کا وزن زیادہ نہیں ہوتا اُس وقت تک معلوم ہوتا ہے کہ شیشے کی شاخوں میں بلور کے پھول لگے ہوئے ہیں۔

آہستہ آہستہ نازک شاخیں اور پتیاں برف کے بوجھ سے گر جاتی ہیں اور درخت کا ڈھانچہ رہ جاتا ہے، جو جلا ہوا اور سیاہ معلوم ہوتا ہے، لیکن قدرت، ننگے درختوں کو بہت جلد بلور اور شیشے کے کپڑے پہنا دیتی ہے۔ ہر درخت جڑ سے چوٹی تک شفاف شیشے کا معلوم ہوتا ہے، جو چاندنی میں ہیرے کی طرح اور دھوپ میں بجلی کی طرح چمکتا ہے۔ برف باری کے علاقے تمام تر پہاڑی ہیں۔ ان علاقوں میں پہاڑ، دامن سے چوٹی تک برف پوش ہو جاتے ہیں، جھیلوں کی سطح جم جاتی ہے۔ اس پر لوگ چلتے ہیں، دوڑتے پھرتے ہیں اور اسکیٹنگ کی مشق کرتے ہیں۔ بچے گھروں سے نکل آتے ہیں اور برف کے گولے بنا کر ایک دوسرے پر پھینکتے ہیں۔ ہر خاندان کے چھوٹے بڑے مل کر نرم برف کا ایک بہت بڑا دیو بناتے ہیں اور اسے مکان کے باہر کھڑا کر دیتے ہیں۔ جیسے جیسے برف گرتی ہے، دیو بڑا ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس موسم میں چشموں اور دریاؤں پر چھوٹی بڑی لہریں جوں کی توں جم جاتی ہیں۔ آبشاروں سے گرتے ہوئے دھارے اسی حالت میں جم جاتے ہیں۔ پانی کی چادریں یوں ہی لٹکی رہ جاتی ہے۔ ذرا غور کرو کہ یہ مناظر کتنے خوب صورت ہوتے ہوں گے۔

برف آتی ہے تو اپنے ساتھ خوب صورتی لاتی ہے اور جب جاتی ہے تو زمین میں چھپی ہوئی خوب صورتی کو نمایاں کرنے کا انتظام کر کے جاتی ہے۔ اس کے جاتے ہی درخت سبز ہو جاتے ہیں اور رنگ برنگے پھول کھلتے ہیں۔ سرد ممالک میں اگر برف نہ گرے تو بہار کبھی نہ آئے۔

پانی کو سائنس دان H_2O کہتے ہیں۔ برف بھی

H_2O ہے فرق یہ ہے کہ اس میں درجۂ حرارت بہتے ہوئے پانی سے کم ہوتا ہے۔ پانی کے جمنے کا کارخانہ قدرت نے ہوا کی بلندیوں پر کھولا ہے اور وہاں برف بنانے میں ایسی کاری گری اور توجہ صرف کی جاتی ہے، جس پر عقل حیران ہے۔

برف باری کی تین صورتیں ہیں:

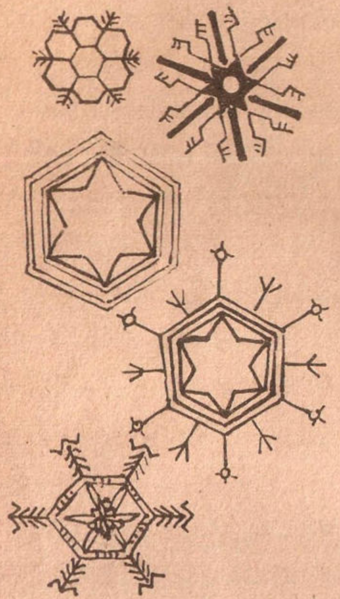
(۱) روئی کے گالوں کی شکل میں

(۲) قلموں یا شاخوں کی شکل میں

(۳) اولوں کی شکل میں

برف کی قلمیں منشور (سہ پہلو شیشے PRISM) کی طرح ہوتی ہیں اور اولے عموماً گول یا چپٹے ہوتے ہیں، لیکن ان کی شکلوں میں ہزار ہا ڈیزائن ہوتے ہیں۔ ہر اولے یا قلم میں برف کے ننھے ننھے ہزارہا ذرات ہوتے ہیں، جن کے اندر جامیٹری کی باقاعدہ شکلیں بڑی درستی کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔

سائنس دانوں نے جب برف کی قاشوں اور ننھے ٹکڑوں کا خوردبین سے مطالعہ کیا تو وہ قدرت کے نقش و نگار دیکھ کر حیران رہ گئے۔ انھوں نے ان ذرات میں دائرے، مثلث منتظم کثیر الاضلاع سے بنی ہوئی ہزاروں خوب صورت شکلیں دریافت کیں۔ یہ شکلیں اور ڈیزائن ناپ کے لحاظ سے اتنے درست ہوتے ہیں کہ آپ جامیٹری باکس استعمال کر کے بھی ایسی درست شکلیں نہیں بنا سکتے۔



برف کے ننھے ٹکڑے $\frac{1}{100}$ انچ سے لے کر $\frac{1}{2}$ انچ تک موٹے ہوتے ہیں۔ قلمیں یا قاشیں سوئی کی طرح پتلی ہوتی ہیں، لیکن ان میں تین سے لے کر چھ تک رُخ ہوتے ہیں اور پوری قلم احتیاط سے تراشی اور ڈھلی ہوئی ہوتی ہے، جیسے شیشے کے کارخانے میں بنائی گئی ہو۔ ان میں سے بعض قلمیں شش پہلو قلفی کی طرح ہوتی ہیں اور دیکھنے میں ننھا سا پیراشوٹ معلوم ہوتی ہیں۔ ان کی یہ شکل بلندی سے زمین کی طرف گرتے ہوئے بن جاتی ہے۔

ڈیزائن کے لحاظ سے برف کے گول ٹکڑوں میں بڑی حیرت انگیز کارگزاری نظر آتی ہے۔ کوئی ٹکڑا پھول معلوم ہوتا ہے، کوئی تارا، کوئی ترشا ہوا ہیرا، کوئی ننھا سا پودا۔ ڈبلیو۔ اے بنٹلے نامی سائنس داں نے ۱۸۸۵ء سے لے کر ۱۹۳۱ء تک مسلسل چھیالیس برس اولوں کو آرپار تراش کر اور بغیر تراشے خوردبین سے دیکھ کر ان میں پائی جانے والی شکلیں بنائیں۔ وہ کہتا ہے کہ تمام شکلیں جامیٹری کے اصولوں پر پائی گئیں اور لاکھوں اولوں میں کسی کا ڈیزائن ایک دوسرے سے نہیں ملا۔ تمام شکلیں خوب صورت، باقاعدہ اور ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔

معلوم ہوتا ہے قدرت ایسے فن کار کا نام ہے، جسے اپنے فن سے محبت ہے اور اسے اس کی پروا نہیں کہ کوئی اس کے فن کی تعریف کرتا ہے یا نہیں۔ قدرت دنیا میں ہر طرف ہر وقت خوب صورتی پیدا کر رہی ہے، خواہ انسان اسے دیکھے یا نہ دیکھے۔ اقبال کا ایک شعر سنو، کیا عمدہ بات کہی ہے:

گلزارِ ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز، اسے بار بار دیکھ

★ ★ ★

ایک حیرت انگیز اعلان

ہمدرد نونہال کی سالانہ خریداری کے لیے

نومبر، دسمبر ۱۹۶۴ء کے شماروں میں اعلان کیا گیا تھا کہ ۳۱، دسمبر ۱۹۶۴ء تک آٹھ روپے ارسال کرنے پر ایک سال کے لیے ہمدرد نونہال جاری کرنے کے علاوہ ایک کتاب "وسط ایشیا کی سیاحت" (جس کی قیمت ڈھائی روپے ہے) بھی بلا قیمت ارسال کی جائے گی۔ نونہالوں کے مطالبہ پر تاریخ میں اضافہ کر کے ۳۱، مارچ ۱۹۶۵ء کر دی گئی ہے۔ اب آپ مارچ کے آخر تک آٹھ روپے منی آرڈر یا پوسٹل آرڈر کے ذریعے بھجوا کر ہمدرد نونہال کے سالانہ خریدار بننے کے علاوہ مذکورہ کتاب بھی بلا قیمت حاصل کر سکتے ہیں۔ وی پی کے ذریعے خریدار بننے والے حضرات کو یہ کتاب نہیں پیش کی جا سکے گی۔ اس اعلان سے جلد فائدہ اٹھایئے۔ اس طرح آپ ہمدرد نونہال کے بارہ پرچے جن کی فی پرچہ کے حساب سے مجموعی قیمت نو روپے ہوتی ہے اور ڈھائی روپے کی کتاب "وسط ایشیا کی سیاحت" کل ساڑھے گیارہ روپے کے بجائے آٹھ روپے میں حاصل کر سکیں گے۔

...



پہیلی

جبریل صدیقی



سب سے الگ اور سب سے انوکھا — ہم نے دیکھا ہے اک پودا
کھیت میں اس کا نام نہیں ہے — باغ میں اس کا کام نہیں ہے
انسانوں کے منھ تک پہنچی — اتنی اونچی شاخ ہے اس کی
بھوک لگے تو آگ بھی کھائے — پانی دینے سے لہرائے
اُوپر آگ اور نیچے پانی — سب سے جدا ہے اس کی نشانی
گڑگڑ اس کی سانس میں دیکھو — جان اس کی اک بانس میں دیکھو
نکلا دھواں اک سانس جو لے لی
بچو، بوجھو تم یہ پہیلی؟





حقہ

دل چسپ اور حیرت انگیز

پال بنیان کی جنّاتی گھڑی



جس میں ایک آدمی بند ہوگیا

پال بنیان امریکا کا بہت مشہور سیّاح اور کاری گر گزُرا ہے ۔ وہ پُرانے زمانے میں اپنے عجیب و غریب کارناموں اور ایجاد کے نمونوں کی بدولت دُنیا بھر میں مشہور ہے ۔ اس نے اپنے ملک کی بھلائی



اور ترقی کے لیے جو کام کیے، اُن میں سے بہت سے ایسے ہیں جن سے ساری دُنیا کے انسانوں نے فائدہ اُٹھایا اور انسانیت کی بہبودی کے لیے اُس نے حیرت انگیز کارنامے انجام دیے۔ اُس کے ساتھیوں کو اور اس کو ایسے ایسے عجیب واقعات پیش آئے کہ اگر وہ ہمت سے کام نہ لیتے اور سوچ سمجھ کر بہادری سے اپنے کاموں پر نہ لگے رہتے تو آج ان کے نام تک بھی کوئی نہ جانتا۔ پال بنیان کو ہمیشہ ایک نئی سُوجھتی تھی۔

ایک مرتبہ اُس نے سوچا کہ ٹکورنا کے مقام پر واشنگٹن میں کورٹ ہاؤس کا گھنٹہ بہت پُرانا ہو گیا ہے۔ اُسے بدل کر نیا گھنٹہ اس سے زیادہ اچھا لگانا چاہیے۔ یہ کام سوچنے کے لیے تو بہت آسان تھا، مگر اس کا کرنا ناممکن نظر آتا تھا۔ بھلا اتنی اُونچی جگہ سے پُرانے گھنٹے کو کیسے اُتاریں اور اس کے بجائے جو گھنٹہ لگائیں، وہ کیسا ہو؟ پال نے سوچ بچار کے بعد اپنے ساتھیوں کو جمع کیا۔ اس کے کیمپ میں یُوں تو ہزاروں کاری گر، انجینیر اور مزدور تھے، لیکن جانی اِنک سلنگر اور عول ڈو[۲] اعلا کاری گر بہت ہوشیار اور لائق تھے، جو پال کے دستِ راست تھے۔ اس نے یہ کام ان دونوں کے سپرد کیا۔ وہ دونوں مستعدی سے کام پر لگ گئے۔ عول نے پال سے وعدہ کر لیا کہ وہ ایک نیا شان دار گھنٹہ تیار کر دے گا۔ جانی نے آمادگی ظاہر کی کہ وہ پُرانے گھنٹے کو اُتار پھینکنے اور نیا گھنٹہ اس کے بجائے لگا دینے کی خدمت انجام دے گا۔ پال کو یقین تھا کہ اب یہ دونوں اس کام کو کر گزریں گے۔ عول کو اپنے ساتھ جانی کے شریک ہونے سے بڑی ڈھارس تھی اور جانی عول کی ہمت اور کاری گری پر بھروسا رکھتا تھا۔

ان دونوں نے ایک ٹھیکے دار کو بُلایا اور اُس سے کہا کہ ہم اس گھنٹے کو تُڑوانا چاہتے ہیں۔ ٹھیکے دار یہ سُن کر حیران رہ گیا۔ اُس نے کہا، "جناب! اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ گھنٹہ گھر تہس نہس ہو جائے گا۔ گھنٹے کو نکالنے کے لیے ساری عمارت کو توڑنا پڑے گا۔" اُنھوں نے فوراً کہا، "کوئی پروا نہیں۔ گھنٹہ ہر حال میں اُتارا جائے گا، خواہ اس عمارت کے بجائے بھی نئی عمارت بنانا پڑے۔" ٹھیکے دار نے جواب دیا، "لیکن یہ گھنٹہ اتنا بڑا اور بھاری ہے کہ اسے کوئی ہلا بھی نہیں سکتا۔ اتنی بلندی سے نیچے کیسے لایا جائے؟" جانی نے سوچ کر کہا، "پھر یہ کام ہم خود کریں گے۔" اور اُس نے اپنا وہ اوزار منگوایا، جس سے جنگل کے درختوں کو کاٹ کر اُن کے شہتیروں کو کھینچا جاتا ہے۔ یہ ایک قسم کی مشین تھی، جس میں آنکڑے لگے ہوئے تھے اور اس کی مدد سے وہ لوگ بڑے اونچے اونچے اور بھاری

درختوں کو کاٹ چھانٹ کر شہتیر تیار کر لیتے تھے۔ جب ٹھیکے دار کو اس نے بتایا تو وہ فوراً اس کی عقل مندی کی تعریف کر کے کہنے لگا، "واقعی یہ تو آپ نے خوب سوچا۔ آپ کی یہ آنکھ والا مشین تو آسانی سے گھنٹہ اُتار لے گی۔" اور اب وہ اس کام کو انجام دینے کے لیے تیار ہو گیا، مگر



شرط یہ تھی کہ یہ گھنٹہ اُس کے ہاتھ پچاس ڈالر میں فروخت کر دیا جائے۔ جانی یہ سوچ کر اس کی شرط ماننے کو تیار ہو گیا کہ یہ پُرانا گھنٹہ حکومت کے کس کام آئے گا۔ پچاس ڈالر وصول ہوں گے اور ٹھیکے دار کے ذریعے اُتارنے کا مرحلہ بھی طے ہو جائے گا، لیکن گھنٹہ اُتارنے کے بعد جب

پال کو خبر ہوئی تو اُس نے حکم دیا کہ یہ گھنٹہ ہمارے کیمپ میں رہنا چاہیے۔ ہم جس جس علاقے میں جائیں گے وہاں اس سے بہت کام لیں گے۔ کیمپ میں لگائیں گے تو کام کے وقت علی الصباح اس کی آواز سے تمام کاری گر اور مزدور جاگ اُٹھیں گے اور پھر اُنھیں وقت کا اندازہ ہوتا

رہے گا۔ ٹھیکے دار کو اس کی مزدوری کی ایک بڑی رقم دے دی گئی۔ وہ خوش ہو کر چلا گیا، لیکن اب جانی اور عول کو یہ فکر ہوئی کہ اس گھنٹے کو کیمپ میں لگانے کے لیے کیسے مرمت کر کے تیار کیا جائے۔ آخر بڑے سوچ بچار کے بعد اُنھوں نے کوئی ترکیب نکال لی اور اُس کو ادل بدل کر کے

کام میں لانے کے قابل بنا لیا اور گاڑی پر لاد کر پال کے کیمپ میں پہنچا دیا گیا۔

جب اس گھنٹے کو کیمپ میں استعمال کیا جانے لگا تو اس کی گرج دار آواز سے کیمپ کے چاروں طرف کے علاقے کے لوگ اچھل پڑتے۔ سوتے ہوئے بچّے ڈر کے مارے چیخنے لگتے۔ کھیلتے ہوئے لڑکے لڑکیاں خوف زدہ ہو کر گھروں میں گھس جاتے۔ بڑے آدمی کانوں میں اُنگلیاں ٹھونس لیتے کہ کہیں کانوں کے پردے نہ پھٹ جائیں۔ عول کو یہ طریقہ پسند نہ آیا۔ اس نے پال سے کہا کہ یہ دقیانوسی گھنٹہ تو آپ نے شہر سے اسی لیے اُتارا ہے کہ اس کی جگہ نیا لگایا جائے۔ اس کی آواز تو لوگوں کے لیے بہت تکلیف کا سبب ہے۔ جب یہ بجنا شروع ہوتا ہے تو بیس منٹ تک بجتا رہتا ہے۔ میلوں دُور تک اس کے شور سے کان پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی۔ یہ مخلوق کی بھلائی ہوئی اور نہ ہمارے کاری گروں مزدوروں کی۔ یہ رات بھر ہر ایک گھنٹے کے بعد شور مچائے گا اور لوگوں کی نیند حرام کرے گا۔" پال کی سمجھ میں بات آ گئی۔ اُس نے بھی سوچا کہ واقعی یہ تو انسانیت کی بھلائی کے بدلے بُرائی ہو گئی۔ اُس نے کہا، "پھر اب کیا کیا جائے؟" عول نے جان سے رائے لی۔ دونوں نے مل کر مشورہ دیا کہ اس گھنٹے میں ہم کچھ تبدیلی کر کے اس کی آواز کو دھیما کریں گے۔ پھر کام

میں آ سکے گا۔" پال نے یہ بات منظور کر لی اور عول نے کام شروع کر دیا۔

اس نے یہ کیا کہ گھنٹے کے ڈائل اور کیس کو بدل کر اس کی مشین کے کل پُرزے بھی تبدیل کر دیے اور اب وہ بھاری گھنٹے کے بجائے جیبی گھڑی کی شکل میں بن گیا، مگر بڑی جناتی گھڑی جس کا قطر ۷ فیٹ کے قریب تھا۔ گھنٹوں کی سوئی چار فیٹ لمبی اور منٹوں کی سوئی چھ فیٹ تھی۔ تین مہینے کی لگاتار محنت سے یہ شان دار عجیب و غریب گھڑی تیار ہوئی۔ پال اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اس میں تیس فیٹ لمبی زنجیر باندھ کر اپنی پتلون کی جیب میں رکھے پھرنے لگا۔ اس سے پہلے اس کی آواز اتنی بھاری اور تیز تھی کہ اُسے سُن کر تین چار آدمی بہرے ہو گئے۔ جنگلوں میں ہرن اور گیدڑ اور لومڑیاں جھاڑیوں سے نکل کر چیختے چلّاتے، مگر اب یہی جناتی گھڑی مرمت کے بعد اتنی آہستہ بولنے لگی کہ صرف پال کو اس کی آواز سُنائی دیتی اور وہ بھی بہت دھیمی۔

اس گھڑی کو سال میں دو بار کوک دی جاتی تھی اور چھ مہینے تک ٹھیک وقت دیتی رہتی تھی۔ کچھ عرصے بعد اس میں پھر ایک خرابی پیدا ہو گئی۔ اس کی ٹک ٹک کی آواز اتنی تیز اور بھاری ہو گئی کہ کم سے کم چار پانچ فرلانگ تک سُنائی دینے لگی اور ہوا کے رُخ پر تو چار پانچ میل دُور تک آسانی سے سُنی

جاسکتی تھی۔ آخر پال نے اسے پھر عول کے سپرد کیا کہ اس کی مرمت کر کے یہ خرابی دُور کرے۔ ذرا اندازہ کیجیے کہ یہ جنّاتی گھڑی پال بنیان اپنی جیب میں لیے پھرتا تھا۔ آخر وہ بھی تو قدوقامت اور دل گردے میں اچھا خاصہ جِن تھا۔ عول نے اپنے کاری گروں کی مدد سے اُسے کھول ڈالا۔ کئی آدمی اس پر چڑھے ہوئے اپنے اپنے اَوزار سنبھالے



کام میں جُتے رہے۔ عول خود بھی کام کر رہا تھا۔ اسی درمیان میں گھڑی کے اندر سے ایک عجیب سی آواز سُنائی دی۔ جیسے کوئی کہہ رہا ہو، "احمق آدمی مجھے اس کے اندر سے نکل آنے دے۔" عول کے ہاتھ سے اَوزار گر پڑا۔ وہ بہت بہادر تھا، مگر اس نے کسی گھڑی یا گھنٹے کو آج تک باتیں کرتے نہیں سُنا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی

پھٹی رہ گئیں۔ دوسرے کاری گر اس سے ذرا فاصلے پر تھے۔ شاید اُنھوں نے یہ آواز نہیں سُنی۔ عول نے دل میں سوچا، یہ اس کا وہم تھا۔ بھلا گھڑی بھی کہیں باتیں کر سکتی ہے۔ سوائے بجنے بجانے اور وقت دینے کے اس میں سے اور کوئی آواز نہیں نکل سکتی۔ اس نے اَوزار اُٹھا کر اپنا کام شروع کر دیا، مگر جُوں ہی اُس کے ایک پیچ کو کسنے لگا، اسی طرح پھر آواز سُنائی دی، "نامعقول پھینک اپنا اَوزار مجھے باہر نکلنے دے۔" اُس وقت دوسرے کاری گر کسی کام سے گئے ہوئے تھے۔ عول اس آواز کو سُن کر کانپ گیا اور اَوزار پھینک کر پاگلوں کی طرح وہاں سے بھاگا۔ بھاگتے بھاگتے وہ ایک لوہار کی دُکان پر جا کر رُکا۔ اس کا سانس پھُولا ہوا تھا اور چہرے سے گھبراہٹ ظاہر ہو رہی تھی۔ اتنے میں اُس نے جانی کو وہاں آتے دیکھا۔ جانی جب عول کے قریب پہنچا تو اُس نے اُسے اس طرح گھبرائے ہوئے دیکھ کر پُوچھا، "کیوں کیا ہوا خیریت تو ہے؟" عول نے اُسے سارا ماجرا کہہ سُنایا۔ جانی ہنسنے لگا اور بولا، "پاگل ہو گئے ہو۔ بھلا گھڑی بھی بات کرتی ہے۔ پیچ زیادہ کس دیے ہوں گے۔ اُس کی ٹک ٹک ٹن ٹن کی آواز ہوئی ہو گی۔" عول نے جانی کو حیرت سے تکتے ہوئے یقین دلایا کہ وہ ٹک ٹک ٹن ٹن کی آواز نہیں تھی۔ اُس نے خوب سُنی ہے۔ وہ کسی انسان کی آواز تھی۔ وہ

دونوں یہ باتیں کر رہے تھے کہ ایک کاری گر وہاں آگیا اور عول سے کہنے لگا، "تم نے پٹیر کو تو آج کہیں نہیں دیکھا۔" عول نے کہا، "نہیں تو۔ وہ تو آج گھڑی کی مرمت میں بھی شریک نہیں ہوا۔ دن بھر نہیں آیا۔" کاری گر نے کہا، وہ رات کو میرے ساتھ کھانا کھانے کے بعد تمھارے پاس مرمت کے کام کے لیے گیا تھا۔ اس کے بعد سے کہیں نظر نہیں آیا۔" اس پر عول کو یاد آیا کہ جب وہ اور دوسرے کاری گر گھڑی کو کھول کر بند کر رہے تھے تو پٹیر ان کے ساتھ کام پر موجود تھا، لیکن رات گئے جب وہ چھٹی کر کے سونے جانے لگا تو دوسرے کاری گر اُس کے ساتھ باہر نکلے، پٹیر اُن میں نہیں تھا۔ اب اس کی سمجھ میں بات آگئی۔ اُس نے زور سے قہقہہ لگایا اور بولا، "تو یہ قصّہ ہے۔ پٹیر میاں ابھی تک گھڑی کے اندر بند چیخ و پکار مچا رہے ہیں۔" سب لوگ اسے حیران ہو کر تکنے لگے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آیا وہ کیا کہہ رہا ہے اور عول اپنے دوست جانی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا گھڑی کی طرف بھاگا۔ وہاں پہنچ کر اُس نے جانی اور دوسرے کاری گروں کی مدد سے بڑی احتیاط کے ساتھ آہستہ آہستہ سارے پیچ کھولے اور پچھلا ڈھکن کھولتے ہوئے ہنس کر پٹیر کو آواز دی، "میرے دوست! اب تو باہر نکل آؤ۔ پہلے ہی کیوں نہ کہہ دیا تھا کہ اندر بند ہو، مگر یہ تم اندر کیسے گھُس

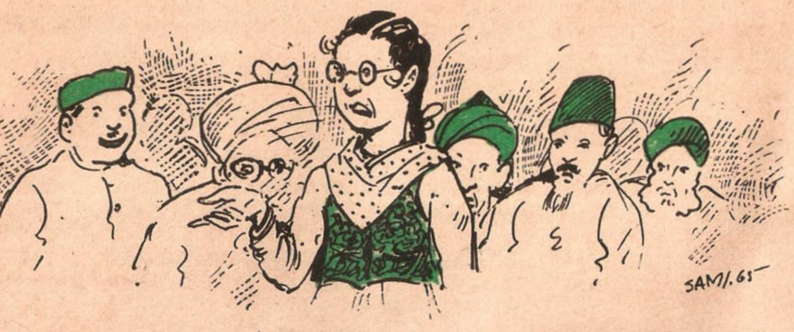
گئے ؟" سب ہی کو تعجب تھا۔ پٹیر نے گھڑی کے اندر سے نکلتے ہوئے اطمینان کا سانس لیا اور بولا، "رات جب میں اندر کی صفائی کر رہا تھا تو تم لوگوں نے ڈھکن بند کر کے پیچ کس دیے، میں اندر بند ہو گیا۔" جانی نے کہا، "تو تم نے آواز کیوں نہ دی؟" پٹیر نے کہا، "میں تو آوازیں دیتا رہا۔ اُنھوں نے اپنی کھٹ پٹ میں میری ایک نہ سُنی۔" جانی ہنسنے لگا۔ اس نے کہا، "معلوم ہوتا ہے یہ سب اُونگ رہے تھے، نیند میں کسی کو کچھ خبر نہ ہوئی۔" اور سب خوب ہنسے۔ اس کے بعد پال نے گھنٹہ گھر پر نصب کرانے کے لیے نئے قسم کا شان دار گھنٹہ بھی بنوایا اور اس گھڑی کو خوشی خوشی اپنے پاس رکھ کر کیمپ کے کام میں لاتا رہا۔ یہ اُسے ہزارہا میل سفر کے دَوران بڑا کام دیتی تھی۔ بھلا اندازہ کیجیے۔ پال بنیان کیسا عجیب انسان تھا، جو اتنی بڑی جناتی گھڑی کو اپنی پتلون کی جیب میں لیے آرام سے میلوں سفر کرتا تھا، جس کے اندر ایک سالم آدمی بند ہو گیا اور کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔ گھڑی سے زیادہ جناتی تو پال بنیان تھا۔

ہماری چاندنی واپس دے دو!

★ کولمبس کو باہر نکلنے کا بہت شوق تھا۔ وہ اپنی جنتری سے یہ معلوم کر لیا کرتا تھا کہ اب چاند گرہن کب ہوگا۔ ایک مرتبہ اُس کی جنتری نے اُس کی جان بچادی۔ ہُوا یُوں کہ ۱۵۰۴ء میں اُسے جزیرہ جمیکا میں کئی ہفتے رہنا پڑ گیا۔ وہاں کے باشندے اُس کے دشمن ہو گئے اور اُنھوں نے اُسے کھانے پینے کی چیزیں دینے سے انکار کر دیا۔

خوش قسمتی سے چاند گرہن قریب تھا۔ کولمبس نے اُن لوگوں کو دھمکی دی کہ اگر اُنھوں نے اُسے کھانا نہ دیا تو وہ چاند کو چُھپادے گا اور اُن کی راتیں اندھیری ہو جائیں گی۔ جزیرے کے باشندوں کو یہ خبر نہ تھی کہ کولمبس کے پاس جنتری موجود ہے۔ جب ۲۹ فروری کو چاند گرہن ہوا تو وہ لوگ بڑے گھبرائے۔ اُنھوں نے فوراً کولمبس کو کھانے پینے کی چیزیں دیں اور اُس کے سامنے ہاتھ پیر جوڑے کہ خدا کے لیے ہمیں ہماری چاندنی واپس دے دو۔





بچّوں کا طرحی مشاعرہ

(دوسری نشست)

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم

سکریٹری : حضرات!

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے یہ ہمارا دوسرا طرحی مشاعرہ ہو رہا ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس وقت یہاں ٹوٹ بٹوٹ تشریف رکھتے ہیں۔ میں ان کی خدمت میں درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس مشاعرے کی صدارت کریں۔ ہم اُن کے بہت شکر گزار ہوں گے۔

دوسرا آدمی : میں تائید کرتا ہوں۔

(تالیاں)

ٹوٹ بٹوٹ : بہنو اور بھائیو! میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے آج کے مشاعرے کا صدر بنا کر عزّت بخشی۔ وقت کافی ہو چکا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اور دیر ہو جائے۔ میں اب مشاعرہ شروع کرتا ہوں آپ کو یہ سُن کر خوشی ہوگی کہ آج کے مشاعرے میں کچھ شاعر لڑکیاں بھی حِصّہ لے رہی ہیں۔ امّید ہے آپ کو اُن کا کلام پسند آئے گا۔ آج جو شاعر آپ کو اپنی غزلیں سُنائیں گے اُن کے نام یہ ہیں:

مسٹر گپٹو گرے۔ جناب ٹوٹرو۔ میاں جھمن، سلمیٰ صاحبہ اور جمیلہ صاحبہ۔

سب سے پہلے مسٹر گپٹو گرے سے درخواست کروں گا کہ وہ آ کر ہمیں اپنا کلام سُنائیں۔

(تالیاں)

گیٹو گرے : حضرات! غزل کے چند شعر عرض کرتا ہوں،

کتنا اچھا، کتنا پیارا مدرسہ — میری آنکھوں کا ہے تارا مدرسہ
جس کسی کی بھی پڑی اُس پر نظر — دیکھتے ہی وہ پکارا مدرسہ
ایک کمرہ، ایک کھڑکی، ایک صحن — اور کیا شے ہے تمھارا مدرسہ
ہوش اُڑ جائیں تمھارے دیکھ کر — آ کے دیکھو تو ہمارا مدرسہ
مدرسے میں آ گیا گیٹو گرے — کیا کرے گا اب بچارا مدرسہ

(تالیاں)

ٹوٹ بٹوٹ : اب جمیلہ صاحبہ اپنا کلام سُنائیں گی۔

جمیلہ :
خوبصورت پیارا پیارا مدرسہ — اِک کھلونا ہے ہمارا مدرسہ
مدرسے ہیں دو ہی اچھے شہر میں — اِک ہمارا اِک تمھارا مدرسہ
میں ہوں تارا مدرسے کی آنکھ کا — ہے مری آنکھوں کا تارا مدرسہ
جس نے بھی دیکھا اُسے آیا پسند — کتنا اچھا ہے ہمارا مدرسہ
اے جمیلہ میری صورت دیکھ کر — جھُومنے لگتا ہے سارا مدرسہ

(تالیاں)

ٹوٹ بٹوٹ : جناب ٹوٹرو صاحب اپنی غزل سُنائیں گے!

ٹوٹرو :
خوب صورت پیارا پیارا مدرسہ — کتنا اچھا ہے ہمارا مدرسہ
کمرہ ہو یا کھیل کا میدان ہو — اپنی نظروں میں ہے سارا مدرسہ
میچ جب بھی کھیلتے ہیں مدرسے — جیت جاتا ہے ہمارا مدرسہ
دونوں اچھے، دونوں پیارے مدرسے — کیا ہمارا کیا تمھارا مدرسہ
دو ٹھکانے ہیں ہمارے ٹوٹرو — گھر ہمارا یا ہمارا مدرسہ

(تالیاں)

ٹوٹ بٹوٹ : اب سلمیٰ صاحبہ اپنا کلام سُنائیں گی!

سلمیٰ :
بھولا بھالا پیارا پیارا مدرسہ — ایک گڑیا ہے ہمارا مدرسہ

ہم ہیں پھولوں اور کلیوں کی طرح — ایک گلشن ہے ہمارا مدرسہ
پیار کرتی ہیں ہمیں استانیاں — کیوں نہ ہو پھر ہم کو پیارا مدرسہ
آسماں پر چاند چمکے جس طرح — یوں چمکتا ہے ہمارا مدرسہ
دور سے سلمیٰ کی صُورت دیکھ کر — جگمگا اُٹھتا ہے سارا مدرسہ

(تالیاں)

ٹوٹ بٹوٹ : اب جناب جھمّن صاحب تشریف لاتے ہیں!
آپ اُن کے شعر سُن کر بہت خوش ہوں گے۔

جھمّن :
ایک ہوتا ہے ہمارا مدرسہ — دوسرا ہوتا تمھارا مدرسہ
کِس طرف جائیں کہاں چُھپ جائیں ہم — شہر کا ہے شہر سارا مدرسہ
دیکھتا ہوں اور نظر آتا نہیں — ہے سمندر کا کنارا مدرسہ
دو ہی چیزیں ہیں نرالی شہر میں — ایک ہم ہیں اِک ہمارا مدرسہ
صحن میں جھمّن کو آتے دیکھ کر — کانپنے لگتا ہے سارا مدرسہ

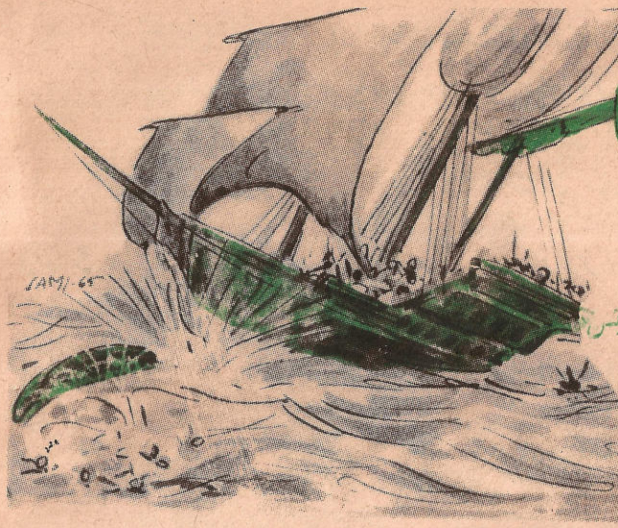
(تالیاں)

(بشکریہ ریڈیو پاکستان)

ایک صاحب : بھئی پوسٹ مین میرا بھی کوئی خط ہے؟ (سیّد احمد مدنی۔ سعودی عرب)
پوسٹ مین : آپ کا نام کیا ہے؟
وہ صاحب : یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے بھئی اس پر لکھا ہوا ہو گا۔

مجسٹریٹ : (چور سے) تم کو معلوم ہے کہ اگر تم نے جھوٹ بولا تو کہاں جاؤ گے؟
چور : جی۔ جہنم میں
مجسٹریٹ : اور اگر سچ تو؟
چور : جی جیل میں

ماسٹر : "بلّی نے چوہا کھالیا"، اس جملے میں مفعول کہاں ہے؟
ایک شاگرد : بلّی کے پیٹ میں ---



اغوا

(دوسرا ٹکڑا)

تحریر: آر۔ ایل۔ اسٹیونسن
: علی اسد

اس کے بعد جہاز تو چلتا رہا، مگر سمندر میں طغیانی شروع ہوگئی، جس کی وجہ سے کبھی تو جہاز کچھ دور آگے بڑھتا اور پھر کبھی طوفان کے تھپیڑے اُسے پیچھے پھینک دیتے۔ دسویں دن اس قدر زبردست کہر چھا گیا کہ جہاز کے ایک کونے سے دوسرا کونا نظر نہیں آتا تھا۔ آخر ایک دن جہاز کسی چیز سے ٹکرا ہی گیا اور بڑے زور کا دھماکا ہوا۔ ایک آدمی چلّایا، "ارے غضب ہوگیا!" کپتان نے کہا، "نہیں، مسٹر ریاش، ہمارا جہاز کسی کشتی سے ٹکرا گیا ہے۔" کپتان کا خیال بالکل صحیح نکلا۔ جہاز کے آگے واقعی ایک کشتی آگئی تھی۔ اور کہر کی وجہ سے نظر تو کچھ آہی نہیں رہا تھا لہٰذا جہاز نے کشتی کے ایک ایسی زبردست ٹکّر ماری کہ کشتی کے تمام مسافر ڈوب گئے۔ صرف ایک شخص بچ گیا تھا، جسے جہاز پر اٹھا لیا گیا تھا۔ اس شخص کی وضع قطع سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی بڑا آدمی ہوگا۔ چناں چہ اس آدمی نے کپتان سے کہا، "دیکھیے! میں آپ سے صاف صاف بتائے دیتا ہوں کہ اگر مجھ کو بادشاہ کے طرف داروں نے پکڑ لیا تو پھر میری خیر نہیں۔ لہٰذا اگر آپ مجھ کو فرانس پہنچا دیں تو

میں آپ کو خاطر خواہ معاوضہ دوں گا۔" یہ سُن کر کپتان کے منھ میں پانی بھر آیا۔ اس نے جواب دیا، "اگر آپ اپنی رقم میں سے آدھی مجھ کو دے دیں تو پھر میں آپ کی مدد کر دوں گا۔" اس آدمی نے کہا، "میرے پاس جو رقم ہے وہ خود میری ملکیت نہیں ہے۔ مگر میں اس میں سے آپ کو ساٹھ اشرفیاں دینے کو تیار ہوں اگر آپ مجھ کو لینی لاج پر اتار دیں۔" چناں چہ کپتان اس پر راضی ہوگیا اور پھر دونوں نے ہاتھ ملا کر آپس میں معاہدہ کر لیا۔

ڈیوڈ اس اجنبی کو بڑی دل چسپی سے دیکھ رہا تھا، کیوں کہ یہ شخص باغی ہونے کی بنا پر جلا وطن کیا جا چکا تھا۔ در اصل یہ شخص اسکاٹلینڈ سے اپنی جان، ہتھیلی پر لے کر نکلا تھا تاکہ اپنے گروہ کے سرغنہ کی مدد کے لیے رُپیہ جمع کر سکے۔ اس باغی جماعت کا سرغنہ فرانس کے بادشاہ کے پاس ملازم ہوگیا تھا۔ آخر ڈیوڈ سے نہ رہا گیا اور اس نے اجنبی سے پوچھ ہی لیا، "تو آپ جیکو بائٹ ہیں؟" اجنبی نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا، اور تمھارے اس منھ لٹکانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم ضرور وِھگ ہو!" اس کے بعد اجنبی نے ڈیوڈ سے شراب لانے کو کہا، ڈیوڈ شراب لینے جب جا رہا تھا تو راستے میں ایک جگہ اس نے دیکھا کہ کپتان اور اس کے چند ساتھی چپکے چپکے آپس میں کچھ مشورہ کر رہے ہیں۔ ڈیوڈ جلدی سے ایک کونے میں چھپ گیا اور ان لوگوں کی باتیں سننے لگا۔ ایک آدمی بولا، "کیا اس آدمی کو اس کمرے کے باہر کسی طرح نہیں بلا سکتے؟" اس پر کپتان بولا، "وہ جہاں ہے وہیں ٹھیک ہے، کیوں کہ اس کمرے میں وہ تلوار نہ چلا سکے گا۔" اس کے بعد ڈیوڈ کونے سے نکل آیا، اس کو دیکھتے ہی کپتان اور اس کے ساتھیوں کو گویا سانپ سونگھ گیا۔ ڈیوڈ نے کپتان سے کہا، "اجنبی نے شراب مانگی ہے۔ ذرا چابی دے دیجیے۔" یہ سن کر ایک آدمی بولا، "چلو یہ موقع بہت اچھا مل گیا۔ اب ڈیوڈ سے پستول اور بندوقیں بھی منگا لی جائیں۔" کپتان نے ڈیوڈ کو سمجھاتے ہوئے کہا، "دیکھو ڈیوڈ، اس اجنبی کی وجہ سے ہم سب کو بے حد اندیشہ ہے اور یہ آدمی ہمارے بادشاہ کا دشمن بھی ہے۔" پھر کپتان نے ڈیوڈ کو بتایا کہ جس کمرے میں وہ اجنبی ہے، اس میں تمام بندوقیں اور کارتوس رکھے ہوئے ہیں۔" لہٰذا ڈیوڈ سے کہا گیا کہ وہ چپکے سے بندوقیں اٹھا لائے تاکہ اجنبی پر اچانک حملہ کر دیا جائے۔ کپتان نے کہا، "ڈیوڈ، اگر یہ کام تم نے خوش اسلوبی سے کر لیا تو پھر کیر ولینا پہنچ کر میں تم کو اس کا صلہ دوں گا۔

یاد رکھو وہاں تم کو میری مدد کی بے حد ضرورت پڑے گی... اور ہاں اس اجنبی کے پاس بے شمار رقم ہے۔ اس میں سے تم کو بھی دوں گا۔" یہ سن کر ڈیوڈ بہت گھبرایا۔ کپتان سے اس نے وعدہ تو اس لیے کر لیا کہ واپسی پر وہ اجنبی کو متنبہ کر دے، لیکن وہ یہ سوچنے لگا کہ جہاز کے تمام بدمعاشوں کے مقابلے میں ایک آدمی اور ایک لڑکا بھلا کیا کر سکیں گے۔ بہر حال جب ڈیوڈ اجنبی کے پاس واپس آیا تو اس نے اجنبی سے تمام ماجرا کہہ سنایا۔ اجنبی بولا، "خیر ابھی تو میں زندہ ہوں۔ یہ بتاؤ کہ کیا تم میرا ساتھ دو گے؟" ڈیوڈ نے جواب دیا، "بے شک! میں کوئی چور ڈاکو تو ہوں نہیں، جو ان بدمعاشوں کا ساتھ دوں گا۔ میں ضرور آپ کی مدد کروں گا۔" اجنبی نے پھر اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا، "میرا نام ہے ایلن برک اور تمھارا نام؟" ڈیو نے اپنا نام بتایا۔ پھر ایلن نے پوچھا، "اچھا یہ بتاؤ کہ یہ بدمعاش سب کتنے ہیں؟" ڈیوڈ نے کہا، "یہ سب پندرہ ہیں۔"

اس کے بعد ایلن نے ڈیوڈ کو نقشۂ جنگ سمجھاتے ہوئے کہا، "میں تو دروازے پر رہتا ہوں، جہاں سے یہ لوگ حملہ کریں گے۔ اس کو تو میں نبٹ لوں گا۔ تم اس طرف سے بالکل مطمئن رہنا۔ مگر دیکھو تم کہیں بھولے سے میری طرف گولی نہ چلا دینا، کیوں کہ تمھاری طرف میری پشت ہو گی۔" ڈیوڈ نے اعتراض کرتے ہوئے کہا، "مگر وہ دروازہ جو آپ کے پیچھے ہے، اس کو تو وہ لوگ توڑ سکتے ہیں۔ اس کا بھی خیال رکھیے۔" ایلن نے کہا، "اب یہ تمھارے ذمے ہے۔ تم پستول لے کر پلنگ پر چڑھ جاؤ اور جب یہ لوگ کھڑکی یا اس دروازے کی طرف سے آنے لگیں تو پھر تم ان کو اپنی گولی کا نشانہ بنا لینا۔ اس کے علاوہ روشندان کی طرف سے بھی خطرہ ہے۔"

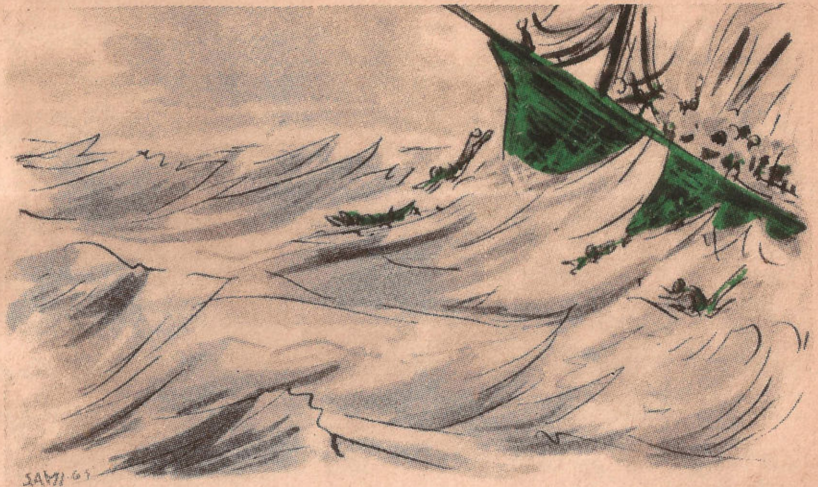
ادھر ڈیوڈ کو واپس آنے میں جو دیر ہوئی تو کپتان گھبرا کر اس کمرے تک آ پہنچا۔ مگر جوں ہی اس نے کمرے میں داخل ہونا چاہا — کہ ایلن نے اپنی تلوار کھینچ کر اس کو للکارا،

"خبردار بس وہیں کھڑے رہو!"

کپتان یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ گھبرا کر وہ بولا، "ہائیں! یہ ننگی تلوار! میری میزبانی کا یہ صلہ!"

ایلن نے رجزیہ انداز میں کپتان کو یوں خطاب کیا، "جانتے ہو میں کون ہوں؟ میری رگوں میں شاہی خون دوڑ رہا ہے اور میرا نام بھی بادشاہوں کا نام ہے۔ میرا نشان امتیاز شاہ بلوط ہے۔ دیکھتے ہو یہ میری تلوار؟ اس تلوار نے اب تک سینکڑوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ جاؤ اور اپنے ساتھ کے تمام بدمعاشوں کو بلا لاؤ اور شروع کر دو حملہ۔" کپتان ایلن سے تو کچھ کہہ نہ پایا، لہٰذا ڈیوڈ کو مخاطب کر کے بولا، "ڈیوڈ، تم کو تو اس جھگڑے میں نہ پڑنا چاہیے تھا۔" یہ کہہ کر کپتان وہاں سے لوٹ گیا اور اپنے ساتھیوں کو تلواریں تقسیم کرنے کے بعد اس نے وعدہ کیا کہ ایلن کو لوٹ کر جو رقم ہاتھ لگے گی، اس میں سے سب کو حصہ ملے گا۔ اس کے بعد حملہ شروع کر دیا گیا۔ کپتان دروازے کی طرف سے حملہ کرنا چاہتا تھا، مگر وہ جگہ اتنی تنگ تھی کہ بیک وقت ایک ہی آدمی وہاں سے گزر سکتا تھا اور ایلن اپنی تلوار لیے وہیں پر ڈٹا ہوا تھا۔ تاکہ جو جو آتا جائے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ اتنے میں ایلن چلّایا، "ڈیوڈ! کھڑکی سنبھالو!" ڈیوڈ نے بھی چیخ کر کہا، "میں سنبھالے ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے گولی چلا دی۔ جو آدمی کھڑکی میں سے کود کر آ رہا تھا وہ ڈیوڈ کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ ادھر ایلن نے دروازے پر جو آتا گیا، اس کو اپنی تلوار سے ٹھکانے لگایا۔ آخر کار کپتان اور اس کے ساتھیوں کے قدم اکھڑ گئے۔ اتنی دیر میں ایلن اور ڈیوڈ نے جلدی جلدی اپنی اپنی بندوقیں پھر سے بھر لیں۔ ایلن نے اسی عرصے میں ڈیوڈ کو بتایا کہ اس کا سب سے جانی دشمن جو آدمی تھا، اس کو لوگ "سرخ لومڑی" کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔

ابھی یہ دونوں باتیں ہی کر رہے تھے کہ یکایک کپتان نے کھڑکی میں سر ڈال کر کہا، "فوراً باہر آ جاؤ۔ شاید اب تم ہی بتا سکو کہ جہاز کو کدھر لے چلیں۔" ایلن نے پوچھا، "کیا مجھ کو دھوکہ دینے کے لیے اب یہ چال چل رہے ہو؟" کپتان بولا، "کیا میرے چہرے سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ دیکھو اس وقت جہاز نہایت سخت خطرے میں گھرا ہوا ہے!" کپتان کے گھبرائے ہوئے چہرے کو دیکھ کر یہ صاف ظاہر تھا کہ واقعی وہ سخت پریشان ہے، لہٰذا ایلن اور ڈیوڈ اپنی اپنی جانیں ہتھیلیوں پر لے کر کمرے کے باہر نکل آئے۔ باہر آنے پر کپتان نے سمندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، "دیکھو، یہاں پر سمندر میں بڑی بڑی چٹانیں ہیں۔ اگر مجھے یہ پہلے سے معلوم ہوتا تو میں تمھاری ساٹھ اشرفیاں تو کیا چھ سو اشرفیوں پر بھی اس طرف کبھی نہ آتا۔" ایلن نے کہا، "میں جہاز رانی کا کام تو خیر جانتا نہیں مگر میرا خیال ہے کہ یہ ٹورن کی چٹانیں ہیں، جن کا سلسلہ تقریباً دس میل تک چلا گیا ہے۔" کپتان نے اپنے ایک ساتھی سے کہا، "مسٹر ریاشس بادبان فوراً باندھ دینا چاہیے۔ جہاز کے



بچنے کی اب کوئی امید نہیں۔" یہ سن کر مسٹر ریاش بادبان باندھنے کے لیے کھمبے پر چڑھتے گئے۔ اتنے میں ہوا اس زور شور سے چلنے لگی کہ جہاز ایک لٹو کی طرح ناچنے لگا۔ بادبان چیتھڑے چیتھڑے ہوگیا۔ اور چشم زدن میں جہاز ایک زبردست چٹان سے ٹکرا گیا۔ ملاحوں نے جلدی جلدی کشتیاں اتارنا شروع کیں۔ ہر طرف ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ لوگوں کی چیخ و پکار اور سمندر کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ بہت سے لوگ زخمی ہوگئے۔ کوئی اِدھر گرا کوئی اُدھر۔ جہاز برابر چکر کھائے جا رہا تھا۔ اور بار بار چٹانوں سے ٹکراتا جا رہا تھا۔ کپتان غصے میں پیچ و تاب کھا رہا تھا اور ہر ایک کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔ آخر کار یہ لوگ کشتی میں بیٹھنے کی کوشش کرنے لگے تاکہ قریب کے جزیرے تک پہنچ جائیں۔ ڈیوڈ نے پوچھا، "یہ کون سی جگہ ہے؟" ایلن نے جواب دیا، "یہ جگہ میرے لیے سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ کیوں کہ یہیں پر کیمپل خاندان کے لوگ رہتے ہیں۔" اتنے میں جہاز پر ایک ملاح چیخا، "ٹھہرو!" عین اسی وقت جہاز ایک بڑی زبردست چٹان سے ایسا ٹکرایا کہ ڈیوڈ ایک تنکے

کی طرح اچھل کر دور سمندر میں جا گرا۔ تھوڑی دیر میں اس کو ایک تختہ مل گیا۔ جسے اس نے خوب مضبوطی سے پکڑ لیا اور تیرتا ہوا کنارے تک پہنچ گیا۔ رات بھر وہ اسی کنارے پر پڑا رہا۔ پھر جب صبح ہوئی تو وہ ایک پہاڑی پر چڑھ گیا تاکہ وہاں سے جہاز کی حالت دیکھ سکے، لیکن جہاز کا کہیں نام و نشان بھی اب نہ تھا۔ اب تک جہاز ڈوب چکا تھا۔ ڈیوڈ کو جہاز کے ساتھیوں کا بھی کوئی پتہ نہ چلا۔ مجبوراً ڈیوڈ اس جزیرے پر کئی دنوں تک پڑا رہا۔ آخر کار اسے معلوم ہوا کہ اس جزیرے کے قریب ایک دوسرا جزیرہ بھی ہے جس کا نام ہے مُل۔ سمندر کا پانی دن بھر میں دو مرتبہ اتنا ہٹ جاتا تھا کہ آدمی اس جزیرے تک چلا جائے۔ چناں چہ ڈیوڈ جزیرہ مُل پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر اسے پتہ چلا کہ اس کے جہاز کے باقی لوگ بھی زندہ ہیں۔ ڈیوڈ نے ایک آدمی سے پوچھا، تم نے کسی آدمی کو امیرانہ لباس میں بھی دیکھا ہے؟" اس آدمی نے جواب دیا، "ہاں، ایک آدمی امیروں جیسے کپڑے پہنے تھا۔ باقی دوسرے لوگ جہازیوں کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔" پھر اس آدمی نے ڈیوڈ کا لباس دیکھتے ہوئے کہا، "اچھا! تو تم ہی وہ ہو، جس کے کوٹ کے بٹن چاندی کے ہیں؟" ڈیوڈ نے جواب دیا، "ہاں، ہیں تو سہی مگر اس سے تمھارا مطلب؟"

تب اس آدمی نے بتایا کہ ایلن نے ڈیوڈ کی شناخت کے لیے اس کے چاندی کے بٹنوں کا تذکرہ کیا تھا۔ پھر اس آدمی نے ڈیوڈ کو کھانا کھلایا اور سونے کا بندوبست کر دیا۔ دوسرے دن اس آدمی نے ڈیوڈ سے کہا، "اب تم اپنے دوست کے پاس چلے جاؤ۔ اس کا وطن ہے ٹورڈسے۔" چناں چہ ڈیوڈ وہاں سے روانہ ہوگیا۔ کئی دنوں کی مسافت طے کرنے کے بعد اس کی ملاقات ایلن کے قبیلے کے ایک آدمی سے ہوئی۔ یہ آدمی ملاح تھا۔ ڈیوڈ نے اس سے ایلن کا پتہ پوچھا۔ اس پر ملاح نے کہا، "وہ تو فرانس میں ہیں، مگر میں تم کو اُن تک پہنچا دوں گا۔" اس کے بعد اس ملاح نے ڈیوڈ کو خوب اچھی طرح پتہ سمجھایا اور کہا، "راستے میں تم کسی سے بات چیت نہ کرنا شاہی آدمیوں سے دور ہی رہنا۔" چناں چہ ڈیوڈ ملاح سے رخصت ہوا۔ چلتے چلتے ایک جگہ وہ تھک کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ نہ جانے ایکارن کا مقام کس طرف ہو۔ اتنے میں اسے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ اور چند سوار آتے ہوئے نظر آئے، ڈیوڈ جھاڑیوں میں چھپ گیا۔ جب وہ سوار نزدیک آگئے تو ڈیوڈ نے بڑھ کر ایک سے ایکارن جانے کا راستہ پوچھا۔ سواروں کے سرغنہ نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ اسی کو

لوگ "سُرخ لومڑی" کے نام سے یاد کیا کرتے ہیں۔

ابھی اس آدمی کا جملہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ کسی نے اس کے ایک ایسا تیر مارا کہ وہ لڑکھڑا کر گھوڑے سے گر پڑا۔ ڈیوڈ نے تیر مارنے والے کو دیکھ لیا تھا۔ چناں چہ وہ چلّایا، "پکڑو، پکڑو"۔ ڈیوڈ یہ چلّاتا ہوا قاتل کو پکڑنے کے لیے دوڑ پڑا، مگر اتنے میں دور سے کسی نے اسے پکارا، "لوٹ آؤ، لوٹ آؤ!" مگر ڈیوڈ بھاگتا ہوا دور نکل گیا۔ آخر کار وہ سپاہیوں کی گولیوں سے بچتا بچاتا ایک جگہ پر جو پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ سامنے ایلن کھڑا ہوا ہے۔ ایلن نے لپک کر ڈیوڈ کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

پھر ایلن نے تیزی سے کہا، "دیکھو، اب جو میں کروں وہی تم بھی کرنا ورنہ ہم دونوں کی جان چلی جائے گی"۔ اس کے بعد یہ دونوں گھومتے گھماتے بڑی دور کا چکّر لگا کر پھر اسی جگہ پہنچ گئے، جہاں ان دونوں کی پہلے مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ اور پھر وہاں ان دونوں نے کچھ دیر کے لیے قیام کیا۔ ڈیوڈ بولا، "ایلن صاحب۔ میں آپ کو بے حد پسند کرتا ہوں مگر آپ کے اور میرے طریقے بالکل جدا جدا ہیں۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اب میں آپ سے علیحدہ ہو جاؤں"۔ اس پر ایلن نے کہا، "ڈیوڈ، میں تو تم سے صرف اس وقت علیحدہ ہوں گا جب تم علیحدگی کی کوئی معقول وجہ پیش کرو گے"۔

ڈیوڈ نے کہا، "آپ کو معلوم ہے کہ وہ شخص جو سڑک پر خون میں لت پت پڑا ہوا ہے، وہی آپ کا جانی دشمن تھا، یعنی وہی "سرخ لومڑی"۔

ایلن نے ڈیوڈ کو سمجھاتے ہوئے کہا، "میں سمجھ گیا کہ تمھارے دل میں کیا ہے۔ مگر ڈیوڈ تمھارا خیال غلط ہے۔ میں ایسی حماقت کبھی نہیں کر سکتا کہ اس آدمی کو اپنے ہی ملک میں مار ڈالوں تاکہ میرے خاندان پر اس وجہ سے مصیبت آ جائے۔ اس کے علاوہ اگر میں نے اس کو مارا ہوتا تو میرے ہاتھ میں کوئی بندوق یا تیر و کمان وغیرہ ضرور ہوتا۔ مگر تم دیکھ رہے ہو کہ میرے پاس تو یہ صرف مچھلی پکڑنے ہی کا سامان ہے"۔ یہ سن کر ڈیوڈ نے حیرت سے کہا، "اچھا! تو پھر آپ نے اُس آدمی کو نہیں مارا!"

الغرض جب ایلن نے ڈیوڈ کو مطمئن کر دیا تو پھر کہا، "اب ہم لوگ یہاں سے آکرن چلتے ہیں۔ وہاں کپڑے وغیرہ بدل کر اور اسلحہ سے لیس ہو کر پھر نکلیں گے"۔ چناں چہ دن بھر دونوں سپاہیوں سے بچتے بچاتے چلتے رہے۔ آخر کار جب رات ہو گئی تو یہ لوگ آکرن کے قریب پہنچ چکے تھے۔ پھر وہاں ایلن نے تین بار سیٹی بجائی۔ اس کے بعد وہ جیمس سے ملنے گئے۔ جیمس اس مقام کا حاکم تھا۔ جیمس نے

ایلن کو دیکھ کر کہا، "بڑا غضب ہو گیا ہے۔ اب اس قتل کی وجہ سے ہمارے ملک میں بڑا تہلکہ مچ جائے گا"۔ ایلن نے کہا، "تم کو تو اس کی موت سے خوش ہونا چاہیے۔ چلو اچھا ہوا کہ کالن رائے ختم ہوا۔ اس پر جیمس بولا، "نہیں، اس وقت وہ زندہ ہوتا تو زیادہ بہتر تھا۔ یوں خوش ہونا اور فخر کرنا اور بات ہے، مگر اب اس خون کا خمیازہ کون بھگتے گا۔ اب ہمارے قصبے اپین کے تمام باشندوں کو سخت پریشانی اٹھانا پڑے گی۔ اور میں ٹھہرا بال بچّے دار"۔

پھر کچھ دیر کے لیے یہ لوگ کچھ سوچتے رہے اس کے بعد جیمس بولا، "میرا خیال ہے کہ سپاہی تمھارے فرانسیسی لباس کو ضرور تلاش کرتے پھریں گے، لہٰذا اس کو بھی جلا ڈالنا مناسب ہوگا۔ ہم لوگ اپنی اپنی بندوقوں کو بھی اسی بنا پر دفن کیے دے رہے ہیں"۔ ایلن نے کہا، "نہیں، میں اپنا فرانسیسی لباس ہرگز نہ جلنے دوں گا"۔ مگر جیمس نے آخر ایلن کو راضی کر ہی لیا اور ڈیوڈ اور ایلن کے لباس تبدیل کر دیے گئے۔

اس کے بعد جیمس نے ایلن کو متنبہ کرتے ہوئے کہا، "دیکھو! میں قاتل کو گرفتار کرنے والے کے لیے انعام مشتہر کیے دیتا ہوں، حالاں کہ یہ تمھارے حق میں نہایت بُرا ہوگا، لیکن اگر لوگوں کو خود میرے اوپر ذرا سا بھی شبہ ہو گیا تو پھر مجھے خود اپنی جان بچانا دشوار ہو جائے گا"۔

یہ سن کر ایلن نے ڈیوڈ سے کہا، "اب ہم دونوں کو یہاں سے فوراً چل دینا چاہیے۔ کیوں کہ کل صبح سے یہاں شاہی سپاہیوں کی بھاگ دوڑ شروع ہو جائے گی"۔ چناں چہ ایلن اور ڈیوڈ بھاگ کر جنگل میں چلے گئے اور چلتے چلتے پہاڑوں کے درمیان ایک کھائی میں جا کر چھپ گئے۔ ایلن نے کہا، "حالانکہ یہ جگہ بھی محفوظ نہیں ہے مگر تم اب سو جاؤ۔ میں پہرا دے رہا ہوں"۔

اِدھر سپاہیوں نے قاتل کی تلاش شروع کر دی تھی۔ لہٰذا جب وہ اس علاقے کا گشت لگا کر نکل گئے تو ایلن نے کہا، "ڈیوڈ، چلو، آخر تو ایک دن مرنا ہی ہے۔ اب یہاں سے نکل چلیں۔ جو ہونا ہوگا ہو رہے گا"۔ چناں چہ دونوں وہاں سے بھی چل پڑے۔ دوسرے دن شام کے قریب یہ دونوں ایک چشمے کے قریب پہنچے اور وہاں خوب منہ ہاتھ دھو کر ذرا تر و تازہ ہوئے۔ اس کے بعد پھر اور آگے بڑھے۔ اسی طرح سے ایک ہفتہ گزر گیا۔ اور یہ دونوں ایک جگہ سے دوسری اور دوسری سے تیسری جگہ بھاگتے ہی رہے۔ ہر طرف سپاہیوں کے غول کے غول گشت کر رہے تھے اور یہ دونوں اُن سے

چھپتے چھپاتے چلے جا رہے تھے۔ آخرکار سامنے ایک پہاڑی دکھائی دی۔ ایلن نے کہا، "اگر ہم لوگ صبح ہونے سے قبل اس پہاڑی پر پہنچ جائیں تو شاید ہماری جانیں بچ جائیں۔" ڈیوڈ نے کہا، "مگر وہاں تک پہنچنے میں سپاہیوں سے مڈبھیڑ ہوجانے کا بھی تو اندیشہ ہے۔" ایلن نے کہا، "ہاں، یہ میں بھی سمجھتا ہوں، لیکن اس کے مقابلے میں اگر ہم لوگوں کو مجبوراً قصبہ ایپن واپس لوٹنا پڑا تب تو ہماری موت لازمی رکھی ہوئی ہے، لہٰذا ڈیوڈ، اب بس تیزی سے بڑھتے چلے ہی چلو۔" چناں چہ یہ دونوں صبح ہونے سے کچھ قبل ہی اس پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گئے۔

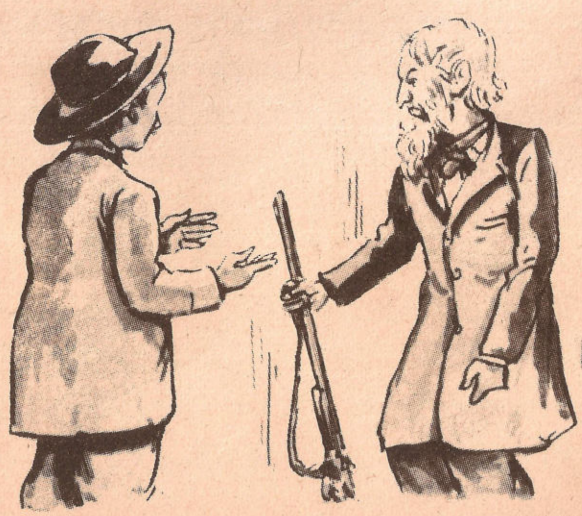
قصہ کوتاہ چلتے چلتے یہ دونوں آخرکار ڈیوڈ کے چچا کے شہر میں پہنچ گئے۔ وہاں ایلن ایک جگہ چھپ گیا۔ اور ڈیوڈ مسٹر رینکیلر کی تلاش میں نکل پڑا۔ راستے میں ایک شخص ملا۔ ڈیوڈ نے اس سے پوچھا، "کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ مسٹر رینکیلر کا مکان کدھر ہے؟" اس شخص نے جواب دیا، "جس مکان سے میں ابھی نکلا ہوں، وہی مکان ہے اور حسن اتفاق سے میں ہی مسٹر رینکیلر ہوں۔" یہ سن کر ڈیوڈ نے جلدی سے اپنا نام بتایا۔ رینکیلر نے انتہائی حیرت سے پوچھا، "ڈیوڈ! آخر اتنے دنوں سے تم کہاں تھے؟" ڈیوڈ نے جواب دیا، "میں بہت دور دراز کی مسافت طے کر کے آیا ہوں۔ بہتر ہوگا اگر یہ گفتگو ہم اور آپ علیحدگی میں کریں۔" وکیل نے کہا، "ہاں، ہاں چلو میرے گھر۔"

اس کے بعد ڈیوڈ نے مسٹر رینکیلر کو اپنا پورا قصہ کہہ سنایا۔ رینکیلر نے پوچھا، "تمھاری شناخت کے لیے تمھارے پاس کیا کوئی کاغذات بھی ہیں؟" ڈیوڈ نے جواب دیا، "جی نہیں۔ لیکن مسٹر کیمپبل کے پاس کچھ کاغذات ہیں، اس کے علاوہ میرا خیال ہے کہ میرے چچا میری تصدیق کرنے سے انکار نہیں کرسکتے۔" وکیل نے ڈیوڈ سے اس کا پورا قصہ تو سنا، لیکن جہاں جہاں ایلن کا نام آتا وہاں وہ کچھ بہرے سے بن جاتے، کیوں کہ وہ یہ جانتے تھے کہ ایلن ایک باغی شخص ہے اور اس کا تذکرہ مناسب نہیں۔ آخر وکیل نے ڈیوڈ کو مشورہ دیا کہ ایلن کا جب تذکرہ کرنے کی ضرورت ہو تو ایلن کے بجائے اس کا نام مسٹر ٹامسن کہہ دیا کرے۔ اس کے بعد وکیل نے ڈیوڈ سے کہا، "تمام جائداد تمھاری ہے۔ اس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں، لیکن اس کے لیے تمھارے چچا سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ ممکن ہے کہ وہ تم کو نہ پہچانیں۔"

اس پر ڈیوڈ نے کہا، "سب سے اہم بات یہ ہے کہ میرے چچا کو یہ بتا دینا ہے کہ انھوں نے مجھ کو اغوا کروایا تھا اور یہ بات اب معلوم ہوگئی ہے۔" وکیل نے کہا، "ہاں، بے شک۔ مگر بہتر یہ ہوگا کہ یہ بات عدالت کے باہر ہی طے کر لی جائے، کیوں کہ تمھارے اور ایلن کے دوستانہ تعلقات اگر ہر شخص کو معلوم ہوگئے تو پھر یہ تمھارے واسطے اچھا نہ ہوگا۔"

چناں چہ ڈیوڈ نے اپنے چچا کو پھانسنے کی ایک ترکیب نکالی اور وہ ترکیب مسٹر رینکیلر کو سنائی۔ انھوں نے بھی اسے بے حد پسند کیا۔

اس کے بعد رینکیلر نے اپنے محرر ٹورنس سے کہا، تمام باتوں کو لکھ لے تاکہ یاد رہیں، اور پھر ڈیوڈ اور رینکیلر اور ان کے محرر ٹورنس روانہ ہوگئے۔ رینکیلر نے ڈیوڈ کو نہایت عمدہ لباس پہنوا دیا تھا۔ آخرکار یہ لوگ اس مقام پر پہنچے، جہاں ڈیوڈ نے ایلن سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہاں ڈیوڈ نے ایک خاص انداز سے سیٹی بجائی، جسے سن کر ایلن نکل آیا۔ رینکیلر نے بہانہ کرتے ہوئے ایلن سے کہا، "مسٹر ٹامسن۔ میں اپنی عینک بھول آیا ہوں۔ ڈیوڈ سے آپ کو معلوم ہوگا کہ بغیر عینک مجھ کو قطعی نہیں دکھائی دیتا ہے، لہٰذا اگر کل



میں آپ کو کہیں دیکھوں اور نہ پہچانوں تو آپ اس کا بُرا نہ مانیے گا۔" ایلن نے جواب دیا، "جی نہیں۔ آپ اس کی مطلق فکر نہ کریں، کیوں کہ ہم لوگ یہاں اس وقت ایک خاص کام کے لیے جمع ہوئے ہیں اور اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دینے کے بعد ہمارے راستے جدا جدا ہو جائیں گے۔ لہٰذا آپ اس بات کی ہرگز فکر نہ کریں۔"

اس کے بعد ایلن اس بڈھے ابن زر کے مکان پہنچا اور آواز دی۔ بڈھے نے ناراض ہو کر کہا، "کیا بات ہے؟ اس وقت یہاں آنے کی آخر کیا وجہ ہے؟ خیال رہے کہ میرے پاس بندوق ہے!" ایلن نے کہا، "اچھا تو آپ ہی ہیں مسٹر بیلفور! ذرا اپنی بندوق کو دور ہی رکھیے۔ میرے یہاں آنے کا سبب ڈیوڈ ہے۔" یہ سنتے ہی بڈھا گھبرا گیا فوراً بولا، "اچّھا، اچّھا۔ اگر یہ بات ہے تو پھر اندر آجائیے۔" ایلن نے کہا، "نہیں، بہتر یہی ہے کہ یہیں آپ کے دروازے پر اس معاملے کو طے کر لیں۔ کیوں کہ میں بھی آپ کی طرح نہایت ڑدار واقع ہوا ہوں، ہاں، تو بات یہ ہے کہ آپ نے جزیرہ مُل کا نام تو ضرور سنا ہوگا۔ چناں چہ اس جزیرہ کے قریب ایک جہاز ٹکرا کر تباہ ہو گیا تھا۔ دوسرے دن وہاں میرے ایک عزیز کو ایک لڑکا نیم مردہ حالت میں ملا۔ وہ قریب قریب ڈوب کر مر ہی چکا تھا۔ بہرحال میرے ان عزیز نے اس لڑکے کی دیکھ بھال کی اور اپنے محل میں اسے رکھ لیا۔ اس لڑکے کی پرورش پر میرے ان عزیز کا اب تک بہت کچھ خرچ ہو چکا ہے اور مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ وہ لڑکا آپ کا بھتیجا ڈیوڈ ہے۔ لہٰذا اگر آپ اپنے بھتیجے کی رہائی کے لیے معقول رقم دے دیں گے تو پھر وہاں سے چھوڑ دیا جائے گا، ورنہ پھر آپ شاید اسے کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔" بڈھا چچا یہ سن کر بولا، "وہ لڑکا نہایت نالائق ہے۔ مجھے اس کی مطلق پروا نہیں۔ میں اس معاملے میں کسی قسم کا دخل دینا مناسب نہیں سمجھتا۔" ایلن نے کہا، "میں سمجھ گیا آپ یہ باتیں محض اس لیے کر رہے ہیں کہ آپ کو رقم کچھ کم دینا پڑے۔ لیکن میں یہ بخوبی جانتا ہوں کہ اپنا خون پھر آخر اپنا ہی ہوتا ہے۔ بھلا آپ اپنے بھائی کی اولاد کو اس طرح کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو گیا...." ابن زر بولا، "لوگوں کو یہ کیسے معلوم ہوگا؟ آپ تو خیر یہ کہیں گے نہیں۔ اور میں بھی کسی سے نہ

کہوں گا، لہٰذا یہ خیال بھی بے کار ہے۔" ایلن بولا، "ممکن ہے کہ ڈیوڈ خود ہی لوگوں سے کہہ دے۔" یہ سُن کر ابن زر نے پوچھا، "آخر یہ کیوں کر ہو سکتا ہے؟" ایلن نے کہا، "جب تک میرے ان عزیز کو یہ امید رہے گی کہ ان کو رُپیہ مل سکتا ہے اس وقت تک تو وہ ڈیوڈ کو اپنے پاس رکھیں گے، لیکن جوں ہی انہیں یہ معلوم ہو گا کہ ان کو رُپیہ نہیں ملے گا، پھر تو وہ اس کو نکال باہر کر دیں گے۔ پھر جہاں بھی اس کا جی چاہے گا، وہ چلا جائے گا۔" یہ سن کر بڈھا بہت پریشان ہوا کہنے لگا، "نہیں، نہیں، یہ تو نہایت برا ہو گا۔" اس کے بعد بڈھے نے کچھ سوچتے ہوئے کہا، "دیکھیے، میں نہایت با اصول آدمی ہوں۔ اگر مجھ کو رُپیہ دینا ہی ہے تو پھر میں دے دوں گا۔" ایلن نے کہا، "ہاں تو پھر یہ بتائیے کہ کتنی رقم آپ دیں گے میں خود سے کوئی رقم نہیں بتاتا۔ بس مجھے تو اتنا بتا دیجیے کہ آپ نے کپتان ہوسیزن کو کتنی رقم دی تھی۔" کپتان ہوسیزن کا نام سننا تھا کہ ابن زر کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ گھبرا کر اس نے پوچھا، "ہوسیزن! ہوسیزن کو میں نے کس کام کے لیے رُپیہ دیا؟" ایلن نے نہایت اطمینان سے جواب دیا، "ڈیوڈ کو اغوا کرنے کے لیے۔" ابن زر چیخنے لگا، "یہ سراسر جھوٹ ہے! بہتان ہے! ڈیوڈ جھوٹ بولتا ہے۔ اسے کسی نے اغوا نہیں کیا۔" ایلن نے کہا، "اس میں نہ میری کوئی خطا ہے اور نہ آپ کی۔ بات دراصل یہ ہے کہ کپتان ہوسیزن نہایت صاف گو آدمی ہیں۔" اب تو ابن زر اور بھی پریشان ہوا کہنے لگا، "اس سے تمھارا کیا مطلب؟ کیا ہوسیزن نے خود تم سے یہ بتایا ہے؟" اب ایلن کو بھی غصہ آ گیا۔ اس نے بھی طیش میں کہا، "اور نہیں تو کیا۔ اگر ہوسیزن، مجھ کو خود نہیں بتاتا تو کیا مجھے علم غیب ہے۔ ہوسیزن میرا ساتھی ہے۔ لہٰذا اب تم جھوٹ بولنے کی کوشش مت کرو۔ اب صاف صاف یہ بتاؤ کہ تم نے اس کو کتنی رقم دی تھی؟" بڈھا اس پر بھی نہ مانا۔ کہنے لگا، "اچھا یہ بتاؤ کہ واقعی کیا ہوسیزن ہی نے تم کو یہ بتایا کہ میں نے اس کو کتنی رقم دی تھی۔" ایلن نے جواب دیا، "یہ میں ابھی نہیں بتاؤں گا۔" اب تو ابن زر کے لیے کوئی صورت نہ رہ گئی تھی۔ چناں چہ مجبور ہو کر وہ بولا، "سچ تو یہ ہے کہ میں نے اسے صرف بینس[2] اشرفیاں دی تھیں اور یہ طے ہوا تھا کہ ڈیوڈ کو بیچ کر امریکہ میں جو رقم ملے، وہ بھی ہوسیزن ہی کی ہو گی۔"

اِدھر مسٹر رینکیلر چھپے ہوئے یہ سب گفتگو سن ہی رہے تھے۔ ابن زر کے منھ سے اقبال جرم سننے کے بعد وہ ڈیوڈ اور اپنے محرر کو لے کر سامنے آ گئے۔ اور ایلن سے کہنے لگے،

”مسٹر ٹامسن۔ آپ کا بہت بہت شکریہ! آپ نے بڑا کام کر دیا؟ اس کے بعد رینکیلر نے ابن زر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، ”مسٹر بیلفور، کہیے مزاج کیسے ہیں؟“ ڈیوڈ نے بھی بڑھ کر اپنے چچا کو سلام کیا۔ اس کے بعد ٹورنس نے بھی بڈھے کی مزاج پرسی کی۔ یہ تمام واقعات کچھ اس تیزی سے ظہور میں آئے کہ ابن زر کے اوسان بالکل خطا ہو گئے۔ اب وہ سمجھا کہ ان لوگوں نے کتنی چالاکی سے اس سے اقبال جرم کروالیا۔ پھر گواہ بھی موجود تھے۔ ابن زر کی اب کمر ٹوٹ چکی تھی۔ وہ نڈھال ہو کر دُہرا ہو گیا۔ ان لوگوں نے جلدی سے اُسے سنبھالا۔ مسٹر رینکیلر بولے، ”مسٹر ابن زر، اتنا پریشان نہ ہوئیے۔ ہم لوگ آپ کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی ہرگز نہ کریں گے۔ فی الحال آپ اپنے تہہ خانے کی چابی ڈیوڈ کو دے دیجیے تاکہ وہ وہاں سے ایک بوتل شراب تو لے آئے اور ہم سب اس کامیابی کا ذرا جشن تو منالیں۔“

اس کے بعد رینکیلر نے ڈیوڈ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، ”مسٹر ڈیوڈ۔ میں آپ کو اس کامیابی پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ در اصل آپ ہی اس تمام دولت کے حق دار ہیں، جس کو آپ کے چچا صاحب ہتھیالینا چاہتے تھے۔ لیجیے یہ خط اور اس کو میرے بنک میں پیش کر دیجیے گا۔ تاکہ تمام رُوپیہ آپ کے نام منتقل ہو جائے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اپنے رُوپے کو خوب سمجھ بوجھ کر خرچ کریں گے۔“

ڈیوڈ نے وکیل کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد رینکیلر سے رخصت ہو کر ڈیوڈ اور ایلن شہر ایڈنبرا کی جانب روانہ ہو گئے۔ راستے میں دونوں مستقبل کے بارے میں صلاح و مشورہ کرتے رہے۔ مگر ان دونوں کو اس وقت وہ تمام حادثات بار بار یاد آرہے تھے، جو ان دونوں پر ساتھ ساتھ گزر چکے تھے۔ آخر ان دونوں میں یہ طے ہوا کہ ایلن اس وقت تک جنگلوں میں چھپا رہے جب تک کہ ڈیوڈ اس کے واسطے جہاز کا بندوبست نہ کر دے۔ تاکہ وہ اسکاٹ لینڈ سے فرار ہو جائے۔

بہر حال وہ دن بھی آخر آہی گیا۔ پھر دونوں دوست ایک دوسرے سے جدا ہونے لگے۔ ڈیوڈ نے رخصت ہوتے ہوئے ایلن سے کہا،

”ایلن صاحب! اللہ آپ کا نگہبان“۔

ایلن کا دل بھی بھر آیا۔ اس نے جواب دیا،

”ڈیوڈ۔ میرے دوست۔

خدا حافظ!“

....

علم و اخلاق

باغ کے رکھوالے نے کبھی پھل نہیں چکھا

پرانے زمانے کا ذکر ہے، ملک عرب میں ایک بڑا امیر آدمی تھا۔ اس کی دولت اور شان کی دور دور ملکوں میں دھوم تھی۔ وہ اپنے قبیلے کا بہت بڑا سردار مانا جاتا تھا۔ جس علاقے میں وہ رہتا تھا، اس کے عالی شان محل، خوش نما باغ باغیچے ایسے شان دار تھے کہ لوگ انھیں عجائبات کی طرح دیکھنے آتے۔ باغ بھی ایک نہیں بہت تھے، جن میں قسم قسم کے پھل پھول اور میوے لگتے۔ اس نے سیر کے لیے ایک خوب صورت محل ایک چشمے کے کنارے بنوایا تھا۔ اس کا نام تھا خاص محل۔ اس کا باغ بھی خاص تھا، جس کے پھل بہت مزے دار اور پھول بے حد خوش بودار تھے۔ اس باغ کی بہار ہر موسم میں یکساں رہتی۔

عرب مہمان نوازی کے لیے مشہور ہیں۔ یہ امیر آدمی بھی دور دور سے لوگوں کو بُلا کر اپنے خاص محل میں مہمان رکھتا۔ دوسرے علاقوں کے بہت سے امیر تو اس کا نام اور خاص محل کی شہرت سُن کر اس کی شان دیکھنے بھی آتے رہتے اور وہ سب کی خاطر مدارات کیا کرتا۔

محل میں یُوں تو سینکڑوں ملازم تھے لیکن خاص باغ کا رکھوالا ایک نوجوان لڑکا تھا۔ اس کا نام ابراہیم تھا۔ وہ اپنے کام میں بہت ہوشیار، نیک اور ایمان دار تھا۔ باغ کا کام تو کئی مالی کرتے تھے، ابراہیم ان سب کے کام کی دیکھ بھال اور باغ کی نگرانی کرتا۔

ایک مرتبہ اس امیر کے خاص محل میں

اِس علاقے کا حاکم اور کچھ رئیس تاجر مہمان ہوئے اور ان سب کی بھاری دعوت کا انتظام کیا گیا۔ سب نے محل کو دیکھ کر اس کی بڑی تعریف کی، پھر خاص باغ کی سیر کی اور اس کی خوب صورتی، سجاوٹ اور روشوں کی آراستگی دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ امیر آدمی نے سب کے لیے کھانے کا انتظام بھی رات کو باغ میں کیا۔ قسم قسم کے مزے دار اور عمدہ کھانے چنے گئے۔ سب مہمانوں نے خوب مزے سے کھائے۔

کھانے سے فارغ ہو کر امیر نے ابراہیم کو بلایا اور فرمائش کی کہ مہمانوں کے لیے انار توڑ کر لاؤ۔ ابراہیم نے خود جا کر عمدہ اور خوش نما سُرخ سُرخ انار درختوں سے توڑے اور انھیں ایک خوب صورت ٹوکری میں لگا کر مہمانوں کے سامنے رکھ دیا۔ سب نے اناروں کے رنگ دیکھ کر بہت تعریف کی۔ امیر آدمی نے انار چھیل کر ان کے خوش رنگ دانے نکالے اور ایک پلیٹ میں سجا کر مہمانوں کو پیش کیے۔

جو بھی حاکم نے ایک دانہ منھ میں لیا، اس کا منھ بگڑ گیا۔ مشکل سے اس نے آنکھیں بند کر کے حلق سے نیچے کیا اور پلیٹ سے ہاتھ کھینچ لیا، مگر اس نے امیر کے لحاظ سے کچھ کہا نہیں اور کسی نے اس کی طرف دیکھ کر اس کے منھ بگڑنے کا بھی خیال نہ کیا۔

لیکن ایک ایک کر کے جب مہمانوں کا یہی حال ہوا کہ جس نے انار کا دانہ منھ میں ڈالا منھ بنایا۔ اب امیر آدمی کو خیال آیا اور اس نے جلدی سے انار چکھ کر دیکھا کہ اس کا مزا کیسا ہے، جو یہ لوگ اس طرح منھ بنا رہے ہیں؟ انار چکھتے ہی اس کے دانت کھٹّے ہو گئے۔ اس کی سمجھ میں آ گیا کہ انار بہت کھٹّا ہے۔ اتنا کھٹّا کہ کوئی بھی نہیں کھا سکتا۔

اس پر امیر نے ابراہیم کو بلایا اور سب کے سامنے پوچھا کہ "ہم نے تمھیں باغ کی نگرانی کے لیے اس لیے رکھا ہے کہ تم اس کی ہر بات کی دیکھ بھال کرو۔ تم اتنی غفلت برتتے ہو کہ تم نے کھٹّے انار مہمانوں کو کھلا کر ان کے منھ کا مزا خراب کر دیا۔ اگر یہ انار کھٹّے تھے تو تمھیں چاہیے تھا کہ ہمیں بتا دیتے اور یہاں نہ لاتے۔"

یہ سن کر ابراہیم نے کہا "میرے آقا، مجھے آپ نے باغ کی رکھوالی کے لیے رکھا ہے، اس کے پھل کھانے کے لیے نہیں۔ میں اس کی سجاوٹ اور پھلوں پھولوں کی تازگی اور خوش رنگی کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔ اگر میں پھل کھاتا تو معلوم ہوتا کہ اس انار کا مزا کیسا ہے۔ میرا کام باغ کے پھل چکھنا نہیں، اس لیے یہ

(باقی ص ۴۴ پر)

بار بار پڑھنے کے قابل

مولوی محمد عبداللہ خاں

اوسان

ہمارے بزرگوں نے بہت سی چیزیں ایسی لکھی ہیں، جو ایک زمانہ گزرنے کے بعد اب بھی پڑھنے اور فائدہ اٹھانے کے قابل ہیں۔

خدائے تعالیٰ نے انسان کو بہت سی صفتیں عطا کی ہیں، جو اس کے لیے نہایت کار آمد ہیں۔ بہادری، حلم، ہمدردی، سخاوت اور اسی طرح کی بہت سی صفتیں ہیں، جو انسان کو اوروں کی نگاہ میں معزّز بنا دیتی ہیں اور خود اس کی ذات کو بھی فائدہ بخشتی ہیں۔ ایک صفت ایسی ہے، جس کی ضرورت کبھی کبھی پڑتی ہے، لیکن ہر بڑے کام کی۔ یہ صفت مصیبت کے وقت آدمی کے اوسان بجا رہنے کی ہے۔ دنیا میں بعض موقعے ایسے پیش آتے ہیں کہ آدمی کی عقل چکّر میں آجاتی ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ ایسے موقعوں پر اوسان بجا رہنے سے مشکل آسان ہو جاتی ہے اور ذرا بھی اوسان خطا ہونے سے کام بگڑ جاتا ہے۔

امیر تیمور دنیا میں بہت بڑا بادشاہ ہوا ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ وہ ملک ترکستان میں ایک قلعے کو فتح کرنے چلا۔ جب موقع پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ قلعے کے چاروں طرف بہت گہری خندق کھدی ہوئی ہے اور جو لوگ قلعے میں گھرے ہوئے ہیں، ان کی تعداد بھی کئی ہزار ہے۔ اگر باقاعدہ طور پر ان سے فوج لڑائی جائے تو خدا جانے کب فتح نصیب ہو۔ امیر رات کے وقت ایک تختے پر سے خندق کے پار ہو گیا اور قلعے کی دیوار پر سیڑھی لگا کر دو تین سو ہمراہیوں سمیت قلعے میں داخل ہو گیا۔ دشمن بے خبر پڑے سو رہے تھے کہ امیر نے بگل بجا کر سوتوں ہی کو مارنا شروع کیا۔ یہ واقعہ دیکھ کر قلعے والوں کے اوسان جاتے رہے اور سمجھے کہ خدا معلوم کس قدر فوج ہم پر آ پڑی ہے۔ سب کے سب قلعہ چھوڑ کر بھاگ کھڑے

ہوئے۔ امیر کو آسانی سے قلعہ ہاتھ آگیا۔ اگر قلعے والوں کے اوسان بجا رہتے تو وہ امیر تیمور کے تھوڑے سے آدمیوں کو، جو قلعے میں داخل ہوئے تھے، پل کی پل میں قتل کر ڈالتے یا زندہ پکڑ لیتے، مگر بگل کی آواز سنتے ہی ان لوگوں کے ایسے ہوش و حواس باختہ ہوئے کہ کچھ تو وہیں مارے گئے اور کچھ بھاگ نکلے۔

اکبر بادشاہ نے اپنے ایک سردار سے پوچھا کہ مصیبت کے وقت کون سی چیز کام آتی ہے؟ عرض کی "جہاں پناہ! اوسان" بادشاہ نے تجربہ کرنے کے لیے ایک دن اس سردار پر ایک مست ہاتھی چھڑوا دیا۔ سردار بے خبر بیٹھا تھا اور کچھ ہتھیار بھی پاس نہ تھا، مگر وہ بالکل نہ گھبرایا۔ دیکھا پاس ہی ایک کتا بیٹھا ہے۔ جھٹ اس کی ٹانگ پکڑ کر ایسا پھرا کر ہاتھی کے مستک پر مارا کہ ہاتھی ڈر کر الٹا بھاگ گیا۔ بادشاہ کو سردار کی بات کا یقین ہوگیا اور اس کو بہت سا انعام دے کر خوش کر دیا۔ بعض طالب علموں کا یہ حال ہوتا ہے کہ جہاں استاد نے ان سے کوئی سوال پوچھا نہیں اور ان کے ہوش و حواس باختہ ہوئے نہیں۔ سوال کچھ ہوتا ہے، جواب کچھ دیتے ہیں۔ اس قدر گھبرا جاتے ہیں کہ ان کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ اُستاد کیا پوچھتا ہے اور ہم کیا کہتے ہیں، جو بات آتی ہے وہ بھی زبان سے نہیں نکلتی۔ ایسے طالب علم اگر اپنی طبیعت پر تھوڑا سا قابو بھی پیدا کریں تو بہت معقول جواب دے سکیں۔

بقیہ "باغ کے رکھوالے نے کبھی پھل نہیں چکھا"

میرا قصور نہیں کہ کھٹے انار آپ کے مہمانوں کے سامنے آئے۔"

سب مہمان اور امیر ابراہیم کی یہ بات سن کر حیران رہ گئے۔ امیر آدمی نے سوچا "واقعی ابراہیم سچ کہتا ہے" اور سب آدمیوں نے نوجوان ابراہیم کی سچائی اور ایمان داری کی بہت تعریف کی کہ اس نیک اور ایمان دار نوجوان نے اتنے بڑے باغ کا رکھوالا ہوتے ہوئے، باغ میں ہر وقت رہتے ہوئے کبھی کوئی پھل چکھا تک نہیں۔

جانتے ہو یہ نوجوان باغ کا رکھوالا کون تھا؟ وہ نیک بزرگ، جو حضرت ابراہیم ادھم کے نام سے مشہور ہوئے اور جن کی نیکی، سچائی اور اخلاق و سیرت کی پاکیزگی کے سبب اللہ تعالےٰ نے ان کو بہت بڑا درجہ عطا کیا۔

بڑھیا، جو شہر سے خوف زدہ تھی



حکیم عطاء الرحمٰن عمر

جب میں شہر جاتی ہوں تو مجھے ہمیشہ بہت خوف معلوم ہوتا ہے۔ مجھے شور و غل، دھکا پیل اور پُرشور ٹریفک سے نفرت ہے۔ اب خرید و فروخت سے بھی دل چسپی نہیں رہی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں شہر کے لیے بہت بوڑھی ہو چکی ہوں۔

لیکن آج مجھے شہر جانا ہی ہوگا۔ مجھے اپنا چشمہ بدلنا ہے۔ کچھ کپڑے بھی خریدنا ہیں اور اس کے علاوہ اور بھی کچھ چیزیں ہیں۔ میں نے ہمت باندھی اور چل کھڑی ہوئی بس پکڑی۔ یہاں سے بندرگاہ کوئی پندرہ میل کے فاصلے پر تھی۔ میں نے سیٹ سے کمر لگالی اور راستے کے مناظر سے دل بہلانے لگی۔ شروع میں راستہ بہت پُرفضا تھا۔ جیسے جیسے شہر آتا گیا، ہوا کی تازگی اور ماحول کی خوش نمائی کم ہوتی چلی اور بالآخر ختم ہو گئی۔ ٹریفک کی رکاوٹیں بڑھتی گئیں۔ جب بس اپنے آخری اسٹاپ کے قریب پہنچنے والی تھی تو ریل کا پھاٹک بند نکلا۔ بہت سی کاریں راستہ کھلنے کے انتظار میں کھڑی تھیں۔ پندرہ منٹ تک پھاٹک کے کھلنے کا انتظار کرنا پڑا۔ بس سے اتر کر پیدل شہر روانہ ہوئی اور شہر کے سب سے بڑے بازار میں داخل ہو گئی۔ ایک بڑی دکان پر پہنچی۔ دکان دار بہت خوش اخلاق تھے۔ انھوں نے میری بڑی آؤ بھگت کی۔ ضرورت کی اکثر چیزیں مجھے اسی ایک دکان سے مل گئیں۔ چند چیزیں اور خریدنے کے بعد میرے پاس گود بھر بنڈل تھے، جن کو اٹھا کر مجھے بس اسٹاپ تک جانا تھا۔ یہ جان جوکھوں کا معاملہ تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ اتنی ساری چیزیں اٹھا کر صحیح سلامت بس

اسٹاپ تک پہنچ سکوں گی، مگر مجبوری تھی۔

میں لڑکھڑاتی ہوئی چلی۔ کئی آدمیوں نے میری طرف نگاہ کرنے کی زحمت تو گوارا کی، لیکن میری مدد کرنے کی توفیق کسی کو نہیں ہوئی۔ وہ سب نہایت جلدی میں تھے۔ خیر میں جوں توں اس چوڑی سڑک تک پہنچ گئی، جو بس اسٹاپ تک جاتی ہے۔ اپنے دل کو تسکین دیتی چلی جا رہی تھی کہ تھوڑی دیر بعد بوڑھی اور تھکی ہوئی ٹانگوں کو آرام مل جائے گا۔ ٹانگوں نے لرزنا شروع کر دیا تھا اور گھٹنے جواب دے چکے تھے۔ میں نے سامان دوسری بغل میں بدلنا چاہا، کیوں کہ اس طرف کا بازو تھک گیا تھا۔ سامان کو دوسری طرف بدل رہی تھی کہ موٹا تازہ اور لمبا آدمی مجھے دھکا دیتا ہوا قریب سے گزرا۔ تمام سامان سڑک پر پھیل گیا۔ بڑی مشکل سے پھر اکٹھا کیا۔ بنڈلوں کی گٹھری تتر بتر ہو گئی اور میں سوچنے لگی کہ اب کیا ہو گا۔

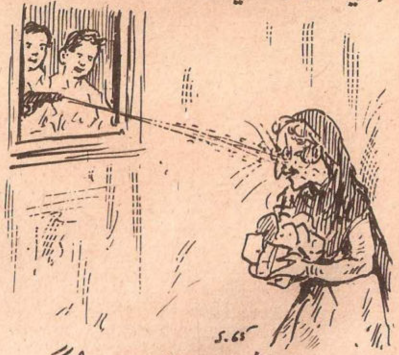
موٹے آدمی نے لوٹ کر بھی نہیں دیکھا کہ کیا ہوا۔ اس کے بعد بھیڑ برابر بڑھتی چلی گئی۔ یہ بھیڑ ساحل کی طرف رواں دواں تھی۔ آدمیوں کے دھکوں کی وجہ سے مجھے اپنا سامان سنبھالنا اور مشکل ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شہر کے تمام لوگ ساحل پر رہتے ہیں اور وہ سب ایک ہی وقت میں گھر پہنچنے کے لیے بے چین ہیں۔ سڑک پر ایک پچھتر سالہ بڑھیا کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ ایک نہایت خوش وضع جوان عورت نے ہاتھ مار کر میرا دوپٹہ کھینچ لیا اور وہ میری گردن میں الجھ کر رہ گیا۔ میں اسے ٹھیک بھی نہیں کر سکتی تھی، کیوں کہ سامان کو کسی جگہ رکھ کر دوپٹہ ٹھیک کرنے کا موقع نہیں تھا اور اگر میں ایسا کرتی تو سامان اور میں دونوں آدمیوں کے قدموں سے کچل کر رہ جاتے۔

میں نے سوچا کہ اتنے آدمیوں میں ایک بھی ایسا نہیں، جو ایک مصیبت زدہ بڑھیا کی مدد کے لیے تیار ہو۔ ایک لمبے قد کا آدمی، جو شان دار لباس پہنے ہوئے تھا اور جس کے بال بڑے سلیقے سے سنورے ہوئے تھے اور دیکھنے میں بہت خوف ناک نظر آتا تھا، میرے اوپر آ کودا۔ وہ بہت برہم معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اپنے برابر والے آدمی سے کہا، "ایسی کھوسٹ بوڑھی عورتیں بھیڑ کے وقت کا انتظار کرنے کے بجائے صبح کے وقت اپنا کام کیوں نہیں کر لیتیں۔"

میرا دل چاہا کہ میں زمین میں گڑ گئی ہوتی۔

اب ایک پرانے گودام کے پاس سے گزر رہی تھی۔

دو شریر لڑکے ایک ٹوٹی ہوئی کھڑکی میں سے زخمی درندوں کی طرح جھانک رہے تھے۔ میں نے یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا معاملہ ہے، ان کی طرف دیکھا اور انھوں نے ٹھیک میرے چہرے اور آنکھوں پر پانی کا پستول چھوڑ دیا اور دونوں شریر لڑکے قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عرصہ دراز کے بعد انھیں مذاق کا بہترین موقع ہاتھ آیا تھا۔



اب برداشت سے زیادہ میری درگت بن چکی تھی۔ میں سوچنے لگی کہ "دنیا کو کیا ہو گیا ہے؟ میرے بچپن میں تو ایسی نہ تھی۔ نوجوانوں نے بوڑھوں کے ساتھ ایسا سلوک کب سے شروع کر دیا ہے؟ میں اپنی آنکھوں سے پانی بھی صاف نہ کر سکی، کیوں کہ میرے دونوں ہاتھ گھرے ہوئے تھے۔ میں بیٹھ کر رونے والی ہی تھی، کیوں کہ میرے گھٹنے جواب دے چکے تھے۔

ایک شریف لڑکے نے میری کہنی کو چھوا، "معاف کیجیے محترمہ! شاید آپ بوجھ سے بری طرح لدی ہوئی ہیں، یہ سامان مجھے دے دیجیے۔ شاید آپ بس پکڑنا چاہتی ہیں۔" یہ لڑکا مجھے بہت ہی پیارا معلوم ہوا۔ میں نے کہا "تم بہت اچھے لڑکے معلوم ہوتے ہو۔ بے شک مجھے اس وقت تمھاری مدد کی سخت ضرورت ہے۔ ابھی میں یہ سوچ رہی تھی کہ میں بس تک کبھی نہ پہنچ سکوں گی۔ تم بہت اچھے آدمی ہو۔"

وہ مسکرایا اور میرا سامان خود لے لیا۔ اس نے بہت آسانی سے سارا سامان ایک ہاتھ میں تھام لیا اور دوسرے ہاتھ سے مجھے سہارا دے کر لے چلا۔

"کیا بس سے اترنے کے بعد آپ کو بہت دور تک چلنا ہو گا؟" مجھے بٹھانے کے بعد میرا سامان بہت خوش اسلوبی کے ساتھ مچان پر چنتے ہوئے اس نے بڑی تشویش کے ساتھ پوچھا۔

میں نے کہا "نہیں، میرے پوتے بہت اچھے ہیں، وہ میری مدد کے لیے موجود ہوں گے۔"

نوجوان رخصت ہونے والا ہی تھا کہ میں نے کہا "میرے پاس شکریے کے الفاظ نہیں ہیں۔ میں سوچ رہی تھی کہ اب اچھے آدمی پیدا ہونا بند ہو گئے ہیں، لیکن خدا کا شکر ہے کہ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں۔" وہ مسکرایا اور ادب سے سلام کر کے چلا گیا۔

اخبار نونہال

ایک ٹکٹ ۳۸۰ پونڈ میں فروخت ہوا

لندن - ۱۳ سالہ طالب علم کولن شیرف گزشتہ ۵ سالوں سے شوقیہ طور پر ٹکٹ جمع کر رہا تھا۔ حال ہی میں لندن کے ایک نیلام گھر میں اس کا ایک ٹکٹ ۳۸۰ پونڈ میں فروخت کیا گیا ہے۔ اس کے ٹکٹ کے لیے ماہرین نے بڑے جوش کے ساتھ بولیاں لگائیں۔ کولن نیلام کے اس منظر کو دیکھ رہا تھا اور اس سے اس قدر متاثر ہوا کہ جب آخری بولی لگائی گئی تو جوش اور خوشی کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کولن نے گزشتہ سال اپنے شہر ڈنفر ملائن میں ایک ڈاک خانے سے ۶ پنس کے تین ٹکٹ اور تین پنس کے تین ٹکٹ خریدے تھے۔ جب وہ ڈاک خانے سے باہر نکلا تو اس نے محسوس کیا کہ ۶ پنس والے ایک ٹکٹ میں زمین کا رنگ جو ہلکا نیلا ہے غائب تھا۔ اس نے ڈاک خانے کے بابو سے اس کی وجہ پوچھنی چاہی، لیکن وہ بہت مشغول تھا اور جواب نہ دے سکا۔ کولن نے اس ٹکٹ کو احتیاط سے رکھ لیا۔ اسے یقین تھا کہ یہ بہت قیمتی ٹکٹ ثابت ہوگا۔ کچھ دن ہوئے اس نے لندن کی ایک مشہور کمپنی کو جو ٹکٹوں کا روبار کرتی ہے یہ ٹکٹ بھیجا۔ اس کمپنی نے اس ٹکٹ کے لیے اسے ۳۵۰ پونڈ دینے کی پیش کش کی، لیکن کولن نے اسے نیلام کرنے کا فیصلہ کیا۔ نیلام کرنے والے مسٹر کیوریل پارمر نے کہا کہ حیرت ہے کہ اس کم عمر لڑکے نے ٹکٹ کی غلطی کو پہچان لیا اور ٹکٹ کی اہمیت جان لی۔

چار سال کی عمر میں آرٹسٹ بن گیا

جنوبی لندن کا چار سالہ جرولڈ ہوڈلیس جو تصویریں بنا رہا ہے، انھیں دیکھ کر آرٹ کے ماہرین بھی حیرت میں رہ گئے ہیں۔ حال ہی میں بچوں کی ایک نمائش میں اسے بڑے بچوں کے مقابلہ میں بہترین تصویریں بنانے کا انعام دیا گیا ہے۔

چارٹ نمبر ۱۱ برائے درجہ دوم و سوم

صفائی

پاک صاف رہو ، اللہ پاک صاف رہنے والے کو پسند کرتا ہے۔
ہر چیز صاف رکھو
بدن صاف کپڑے صاف چہرہ صاف ہاتھ پاؤں صاف دانت منہ صاف
کتاب صاف کاپی، تختی ، سلیٹ اور بستہ صاف بینچ صاف بیٹھنے کی جگہ صاف
صاف نہ ہو تو صاف کر لو

اپنا کام خود کرو اور دوسروں کی مدد کرو
قلم ، دوات اور سلیٹ صاف کرنیکے لیے الگ کپڑا رکھو ، اپنے کپڑوں سے کوئی چیز صاف نہ کرو ، اگر کہیں روشنائی لگ جائے تو فوراً دھو لو۔

جن بچّوں کے کپڑوں پر دھبّے ہوں ، بستہ میلا ، کتاب کے ورق مَلے دَلے اور تختی سلیٹ ٹوٹی پھوٹی ہو — وہ گندے گنوار اور پھُوَاڑ کہلاتے ہیں۔

تم پھُوَاڑ نہ بنو ، ناک میں انگلی نہ ڈالو ، باہر جا کر ایک کونہ میں ناک صاف کرو آستین یا دامن سے ناک نہ پونچھو ، ناک پونچھنے کے لیے رومال یا چھوٹا سا کپڑا الگ رکھو ، بے جگہ مت تھوکو ، باہر جا کر تھوکو۔

بلغم نگلنا گھِن کی بات ہے ، ناخنوں کو بڑھائے رکھنا پھُوَاڑپن ہے ، دانتوں سے ناخن نہ کُترو ، ہونٹ مت چباؤ ، بُری بات ہے۔

ہاتھ سے مکھّی مارنا عیب کی بات ہے ، بیڑی ، سگریٹ پینا ، تاش کھیلنا ، شرم کی بات ہے۔

پڑھنے والے بچّے اچھّے ہوتے ہیں ، تم اچھّے رہو ، اچھّے بنو۔

خرگوش اور کچھوے کی دوڑ



اگرچہ یہ کہانی بہت پرانی ہے، پھر بھی اس کا سبق آج بھی تازہ ہے۔ اس کہانی میں دلچسپ چیز یہ ہے کہ ایک کچھوا باوجود بوڑھا اور سست ہونے کے خرگوش کے مقابلے میں دوڑ جیت گیا، حالانکہ خرگوش جوان اور صحت مند تھا۔ اس کے علاوہ اس کے نہایت چست و چالاک ہونے کی وجہ سے کچھوے کے مقابلے میں جیت جانے کا زیادہ امکان تھا، مگر ہوا یہ کہ خرگوش خوابِ غفلت میں پڑا سوتا رہا اور کچھوا بازی لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔

خرگوش اور کچھوے کی تصویریں گتّے کی کاٹو۔ ہر تصویر چار انچ بڑی ہو اور ہر تصویر کے درمیان میں ایک سوراخ کرو۔ پھر ان دو پرانے حریفوں کی دوڑ دکھانے کے لیے دو دھاگے کے دس سے بارہ فیٹ لمبے ٹکڑے کرسیوں سے باندھ لو اور اگر اس کھیل کو کہیں گھر سے باہر کسی کھلی جگہ پر دکھانا چاہو تو درختوں کے تنے یا دو موٹے موٹے ڈنڈے زمین میں گاڑ کر جو ایک دوسرے کے بالکل قریب قریب ہوں، اُن میں ایک دھاگے کو خرگوش کے سوراخ میں گزارو اور دوسرے دھاگے کو کچھوے کے سوراخ سے۔ پھر دو کھلاڑی دھاگے کے سروں کو پکڑیں اور پھر گتّے کی ان تصویروں کو اوپر سے نیچے کو دوڑائیں۔ دھاگے ذرا ترچھے رکھے جائیں پھر دیکھو اس کھیل میں کیسا لطف آتا ہے! سچ پوچھو تو یوں معلوم ہوگا کہ جانے سچ مچ خرگوش اور کچھوے کی دوڑ ہو رہی ہے۔

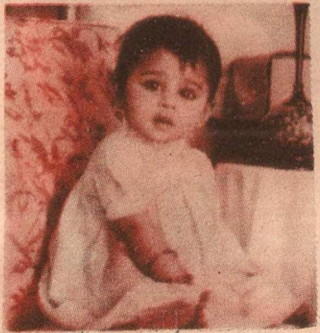
صحت مند نونہال



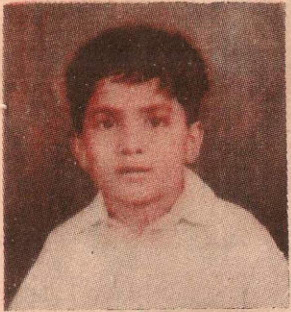
محمد حفیظ الرحمٰن - پیروالہ



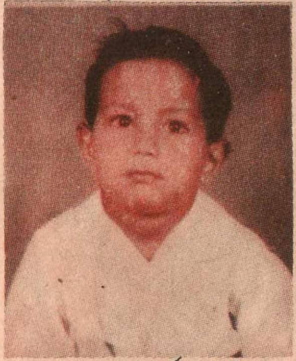
آمنہ خاتون عرف فرح انجم، کراچی



شہناز خالد - کراچی



اعجاز عارف - لائل پور



علی ظفر - کراچی



نعیم خالد عرف گڈو - راولپنڈی



بابر اقبال اور گلشن فردوس - لاہور



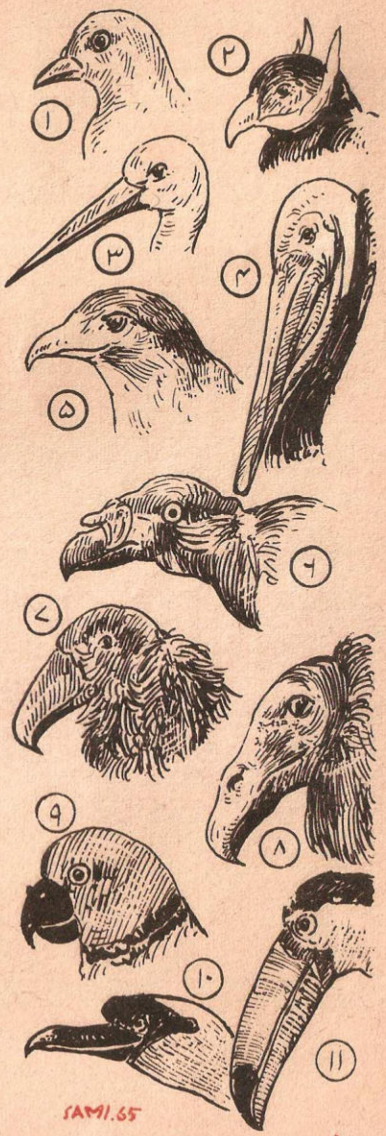
محمد حبیب - کراچی



ریحانہ شمیم - ڈھاکہ

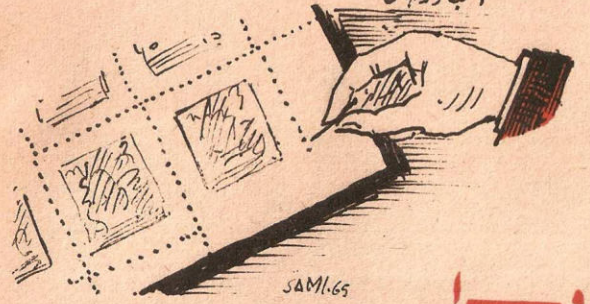


یوسف نسیم - اور - صوفیہ نسیم - کراچی



چونچیں ہی چونچیں

پرندوں کی چونچ کا اصل مقصد اس کا وہ اِستعمال ہے، جس کے لیے وہ بنائی گئی ہے، یعنی اس کی مدد سے غذا کھانا وغیرہ۔ ہر ایک پرندے کو قدرت نے اس کی ضرورت کی مناسبت سے چونچ عطا کی ہے، مثلاً کبوتر (ش ۱) اور کانوں والا تیتر (ش ۲)، ان دونوں کی چونچ چھوٹی ہوتی ہے اور وہ اسی سے چھوٹے چھوٹے دانے چُگ سکتے ہیں۔ اس کے برعکس سارس (ش ۳) اور حواصل (پیلیکن) (ش ۴) کی چونچیں اِتنی لمبی ہوتی ہیں کہ انھیں پانی میں سے مچھلی پکڑنے میں آسانی ہو۔ شکرے (ش ۵) کی چونچ خم دار نوکیلی ہوتی ہے۔ یہ شکاری پرندہ چوں کہ گوشت خور ہے، اس لیے اس کی چونچ ایسی بنی ہے کہ اس کو گوشت کھانے میں مدد ملے۔ اسی طرح کنگ ولچر (شاہ گدھ) (۶) کیلی فورنین گدھ (۷) اور ٹرکی بزرڈ (ش ۸) ان سب کی چونچیں بھی نوک دار جھکی ہوئی ہوتی ہیں اور انھیں مُردار گوشت کھانے میں مدد دیتی ہیں۔ توتا (ش ۹) چونچ کی ساخت کے اعتبار سے توتے کا شمار گوشت خوروں میں ہوتا ہے اور بعض توتے اکثر گوشت بھی کھاتے ہیں، مگر عام طور پر توتے اپنی چونچ سے پھل اور بیج وغیرہ کو اسی طرح کتر کر میں ڈالتے ہیں کہ وہ بالکل باریک ریت کی طرح ہو جائیں اور ان کے نگلنے میں ان کو بالکل تکلیف نہ ہو۔ دنیا کے قابل ترین انسان بھی آج تک نہ معلوم کر سکے کہ میوٹ ہنس (ش ۱۰) کی چونچ کے اوپر جو سر کا کافی حصّہ نکلا رہتا ہے اس کا مقصد کیا ہے اور وہ کیوں بنایا گیا ہے، اسی طرح ٹیوکن (ش ۱۱) کی چونچ کیوں اس قدر لمبی اور ہلکی ہے اور اس کا کیا مقصد ہے!



آل پن کا جادو—!

آج سے تقریباً ایک سو سترہ سال پہلے ایک اخباری رپورٹر ہوٹل کے اندر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پاس شراب کا گلاس رکھا تھا۔ رات کافی سرد تھی۔ وہ شخص لندن سے باہر اخباروں کو خبریں بھیج رہا تھا۔ لفافہ بند کرنے کے بعد اُس نے اپنی جیب سے ٹکٹوں کا کاغذ نکالا اور چاقو تلاش کرنے لگا مگر چاقو نہیں ملا۔ چاقو سے وہ ٹکٹ کاٹ کر ایک دوسرے سے علیحدہ کیا کرتا تھا۔ آخر اُس نے ایک آل پن اٹھائی اور چھپے ہوئے ٹکٹوں کے چاروں طرف سوراخ کرنے لگا جب وہ یہ کام کر رہا تھا ایک دوسرا شخص جس کا نام ہنری ارچر تھا، غور سے دیکھنے لگا اور اس کے دماغ میں خیال آیا کہ کیوں نہ سوراخوں کی قطار بنانے والی مشین ایجاد کی جائے جس سے ٹکٹوں کو علیحدہ کرنے میں مدد مل سکے۔

ہنری نے بڑے سوچ بچار کے بعد ایک مشین بنائی، پھر دوسری بنائی، مگر انگلستان کے محکمہ ڈاک نے وہ مشین پسند نہ کی، پھر جب اُس نے تیسری مشین بنائی تو وہ ۱۸۴۸ء میں پیٹنٹ ہو گئی۔ یہ مشین کچھ ترمیم کے بعد ۱۸۵۴ء میں انگلستان میں رائج ہوئی اور اس کے بعد دوسرے ملکوں نے بھی وہ مشینیں خریدیں۔ امریکا نے بھی ۱۸۵۷ء میں اس کا استعمال شروع کر دیا۔ ہنری ارچر کی اِس ایجاد نے دنیا کو ایک نئی اور کار آمد چیز دی، مگر ہم اس اخباری رپورٹر کے نام سے واقف نہیں ہیں جس کی بدولت ہنری ارچر کو اس مشین کا خیال سوجھا اور اس نے اس خیال کو عملی جامہ پہنا کر دنیا کو فائدہ پہنچایا۔

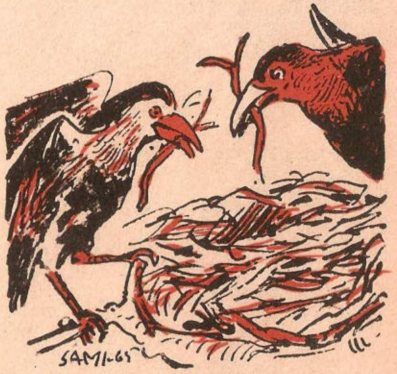
کائیں کائیں کی کہانی



تم نے اکثر دیکھا ہوگا کہ جب کھیتوں میں ہل چلائے جاتے ہیں تو زمین کے اندر سے چھوٹے چھوٹے کیڑے نکل کر اوپر آجاتے ہیں۔

کوّوں کے غول کے غول وہاں آکر ان کیڑوں کو کھاجاتے ہیں۔ تمام علاقہ ان کی کائیں کائیں سے گونج اٹھتا ہے۔ یہ ان کی اور ان کے بچّوں کی خوراک ہوتی ہے۔





اگر تمہارے مکان کے نزدیک کوئی باغ ہے تو تم دیکھو گے کہ کوّے ادھر ادھر اڑتے پھرتے ہیں اور ان کی چونچ میں تنکے ہوتے ہیں ان سے وہ اپنے گھونسلے بناتے اور ان کو ٹھیک کرتے ہیں۔



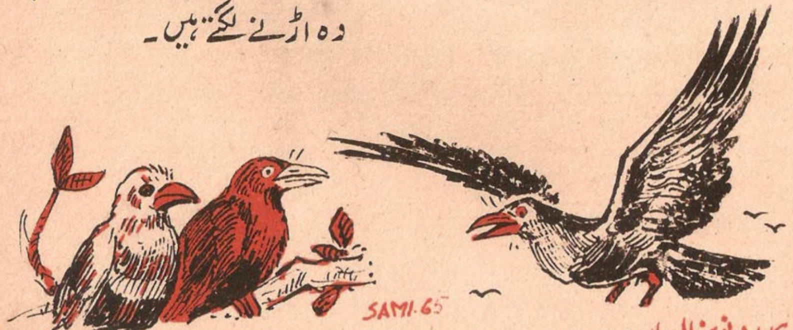
اپنا گھونسلہ ٹھیک کرنے کے بعد کوّے کی مادہ اس میں انڈے دیتی ہے۔

نر کوّا اور اس کی مادہ دونوں باری باری ان انڈوں کو سیتے ہیں، جب تک کہ ان میں سے بچّے نہ نکل آئیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے کیڑے لاتے ہیں تاکہ ان کو خوراک ملتی رہے۔

بچّے نکلنے کے بعد نر کوّا اور مادہ دونوں اپنے ننھے منّے بچّوں کے لیے چھوٹے چھوٹے کیڑے لاتے ہیں اور ان کو کھلاتے ہیں، ان کی دیکھ بھال بھی کرتے ہیں۔



جب بچّے ذرا بڑے ہوجاتے ہیں تو ان کی ماں انھیں اڑنا سکھاتی ہے اور وہ اڑنے لگتے ہیں۔



ذہنی ورزش



ننھا باڈی بلڈر

۱۔ سلیم نام کا ایک کسان آلوؤں کا ایک تھیلا اٹھائے لیے آرہا ہے۔ جاوید نام کے کسان کے ہاتھ میں پانچ تھیلے ہیں۔ دونوں اپنے اپنے تھیلے ہاتھوں میں اٹھائے لیے آرہے ہیں۔ باوجود اس کے کہ تمام تھیلے سائز میں یکساں ہیں، لیکن سلیم کا تھیلا سب میں وزنی معلوم ہوتا ہے۔ بھلا کیوں؟

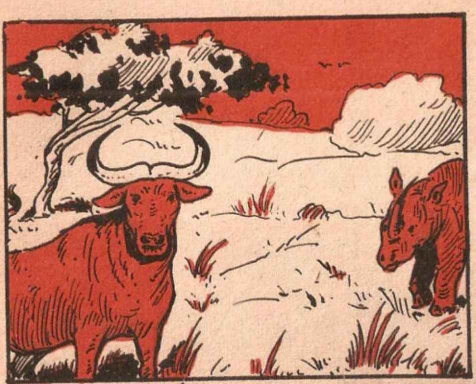
۲۔ ایک مرتبہ جمیل نام کے ایک لڑکے نے اپنے چچا سے دریافت کیا کہ آپ کب پیدا ہوئے تھے؟ اُس کے چچا نے جواب میں کہا کہ اگر تم میرے پیدا ہونے کے سن کے ہندسوں کو ایک کاغذ پر اوپر نیچے لکھ کر اوپر کے حصے کو نیچے الٹ دو تو الٹ پھیر کرنے کے باوجود سن کے ہندسوں میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ بس یہی میری ولادت کی تاریخ ہے۔ بھلا بوجھو تو؟

۳۔ اگر ویگن کے پہیے کی کمانیوں کے درمیان ۱۸ خالی جگہیں ہوں تو بتاؤ اس پہیے میں کل کتنی کمانیاں ہوں گی؟

(جوابات صفحہ ۸۹ پر دیکھو)

شیر ببر

جو افریقی جنگل کا بادشاہ تھا



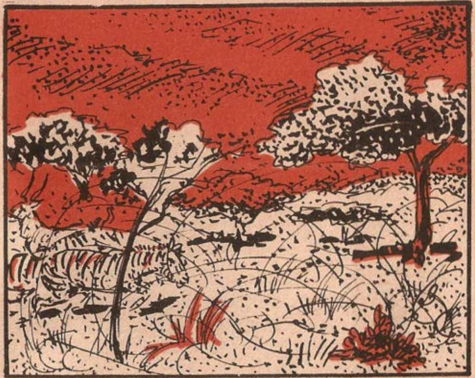
رینو جب چٹان سے اٹھ کر کھلے میدان کی طرف چلا تو راستے میں اس نے ارنے بھینسے اور گینڈے کو جنگ پر تیار دیکھا۔ یہ دونوں بھی شیر ببر کے بڑے دشمن ہیں۔ جب موقع پاتے ہیں اپنا کام کر جاتے ہیں۔

رینو لنگڑاتا ہوا، آہستہ آہستہ کھلے میدان میں آگیا اور ایک سائے دار درخت کے نیچے آکر لیٹ گیا۔ چاروں طرف ہرن، زیبرا اور دوسرے جانور بڑے اطمینان سے سوکھی گھاس کھا رہے تھے۔

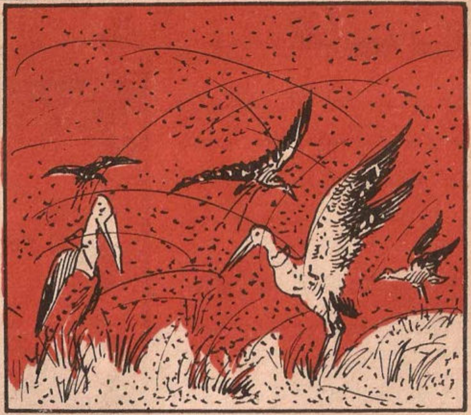




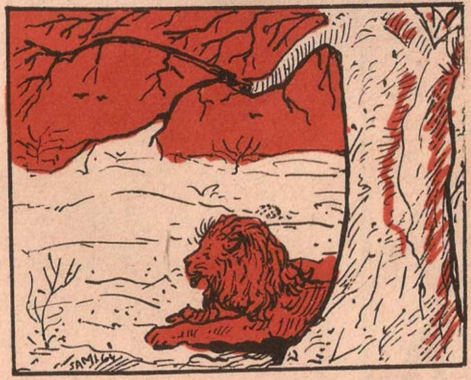
کئی دن سے بارش نہیں ہوئی تھی اور صرف درختوں پر کچھ پتیاں تھیں، جنھیں زراف اپنی لمبی لمبی زبانوں سے لپک کر کھا رہے تھے اور اپنی اونچی گردنوں کا فائدہ اٹھا رہے تھے۔



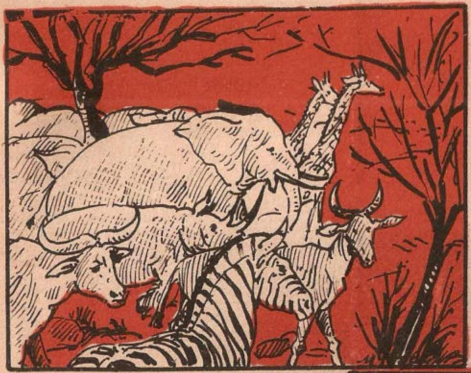
رینو کے لیٹنے کے چند منٹ بعد آندھی کی خوف ناک آواز سنائی دینے لگی۔ تمام آسمان سیاہ ہوگیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تمام جنگل میں ٹڈی دل چھاگیا۔ جانور اس ناگہانی مصیبت سے گھبرا کر اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔



جنگل کے پرندے بھی زمین پر اتر آئے تاکہ گھاس پر بیٹھی ہوئی ٹڈیوں کو کھا کر ختم کردیں، مگر ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ پرندے بھی ہار گئے۔ آخر کہاں تک کھاتے۔



ہرا بھرا جنگل چند گھنٹوں میں لکڑیوں کا پنجر بن گیا۔ سبزہ بالکل غائب ہوگیا۔ صرف شاخیں اور تنے رہ گئے۔ رینو بیٹھا ہوا یہ سب کچھ دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ اب آگے دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ خدا جانے اس کی ملکہ اور بچے کس حال میں ہیں۔



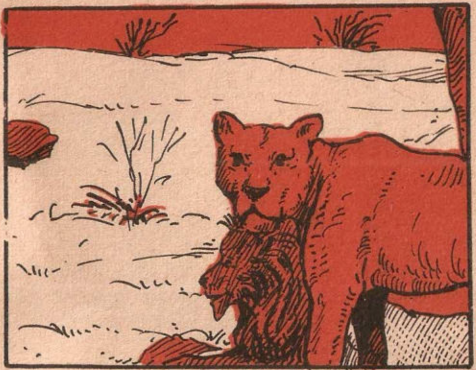
رینو دو تین دن تک خاموش لیٹا رہا۔ جنگل کے جانور سب ایک جگہ کھلے میدان میں جمع ہونا شروع ہوئے، سب خاموش تھے۔ نہ کوئی کسی سے لڑ رہا تھا نہ جھگڑ رہا تھا۔ شام تک ایک بہت بڑا قافلہ ہوگیا اور کسی نہ معلوم مقام کی طرف روانہ ہوا۔



سب جانوروں کی ایک ہی خواہش تھی کہ اب کسی ایسی جگہ جائیں جہاں پھر امن چین سے رہنے لگیں۔ خوب سیر ہو کر پانی پییں اور گھاس کھائیں۔ اس قافلے میں سبزی خور اور گوشت خور ایک ساتھ ہم سفر تھے۔ ایک دوسرے سے بالکل بے پروا۔



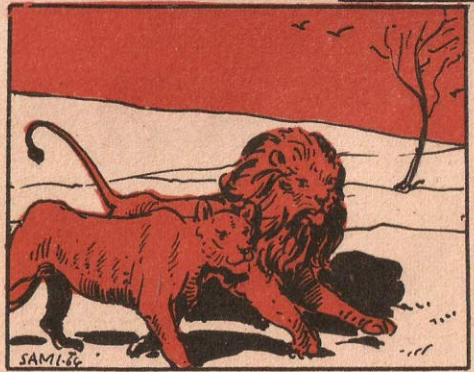
رینو کے لیے اس ہرے بھرے جنگل کا اس طرح برباد ہونا بڑا ہی پریشان کن تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ خدا معلوم وہ اچھے دن پھر لوٹ کر آئیں گے یا نہیں۔ قافلہ کے بعد کچھ کمزور قسم کے جانور اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ رینو کمزوری کی وجہ سے بیٹھا غرّا رہا تھا۔



رینو بظاہر خاموش تھا، مگر اس کے چہرے سے پریشانی ظاہر تھی۔ ایک جوان شیرنی کو اس پر ترس آیا اور وہ اس کے نزدیک آ کر کھڑی ہو گئی اور تمام دن اپنے جسم سے اس پر سایہ کیے رہی۔ اس نے اندازہ لگایا تھا کہ رینو کی کمزوری کی وجہ بھوک ہے۔



شام ہوتے ہی شیرنی شکار کے لیے نکل گئی۔ قریب ہی شکار مل گیا۔ رینو بھی وہاں پہنچ گیا اور دونوں نے خوب سیر ہو کر گوشت کھایا۔ رات وہیں گزاری اور صبح بچا ہوا شکار کا گوشت کھا کر دونوں تازہ ہو کر اپنے سفر پر روانہ ہوئے۔



آج رینو بہت خوش تھا۔ اس میں طاقت آ گئی تھی۔ نئی ملکہ ساتھ تھی۔ دونوں تیزی سے نئی چراگاہ کی طرف چلے جا رہے تھے۔ جہاں پہلے سے بڑا قافلہ کیا ہوا تھا۔

(باقی اپریل کے ہمدرد نونہال میں پڑھو!)

انعامی کارٹون



مجھے یقین ہے کہ تمھیں آج کا سبق ہمیشہ یاد رہے گا اور اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ ....

اس جملہ کو مکمل کرو! صحیح الفاظ سے جملے کو مکمل کرنے والے نونہال کو انعام میں ایک اچھی سی کتاب دی جائے گی۔ ایک سے زیادہ صحیح جواب آنے کی صورت میں قرعہ کے ذریعے ایک نام نکال کیا جائے گا۔

عقل مند کِسان



گولکنڈہ میں بہت عرصہ ہوا ایک کسان رہا کرتا تھا۔ ایک دن جب وہ اپنے کھیت میں بیج بو رہا تھا تو نواب معمولی پوشاک میں گھوڑے پر سوار کھیت کے پاس سے گزر رہا تھا۔ اس کی نظر کسان پر پڑی تو اس نے سوچا کہ اس چھوٹے سے کھیت میں کام کرنے والے کسان سے اس کا کچھ حال پوچھیں۔

کھیت کے کنارے اتر کر نواب نے کِسان سے کہا "کیوں بھائی، کھیتی باڑی میں کچھ فائدہ ہوتا ہے یا نہیں؟"

کسان نے سر اونچا کر کے کہا "فائدہ کیا ہوتا، اگر فصل اچھی ہوگئی تو اسّی رُپے کے قریب مِل جاتے ہیں۔"

کِسان نواب کو پہچانتا نہیں تھا۔

نواب نے پوچھا "اس رُپے کو تم کیسے خرچ کرتے ہو؟"

کِسان نے جواب دیا "خرچ کیا کرتا ہوں بابو صاحب، بیس رُپے ٹیکس ادا کرنے میں چلے جاتے ہیں، بیس قرض چُکانے میں ختم ہو جاتے ہیں، بیس میں اُدھار دیتا ہوں، اور باقی بیس یوں ہی لُٹا دیتا ہوں۔"

یہ سن کر نواب کو بڑا تعجّب ہُوا۔ وہ کہنے لگا "مجھے ذرا سمجھاؤ تو سہی، قرض چُکاتے بھی ہو اور قرض دیتے بھی ہو۔ یہ بتاؤ کہ ایسا کِس کا قرض ہے کہ ہر فصل میں چُکاتے رہتے ہو پھر بھی وہ ختم نہیں ہوتا؟ اور وہ کون ہے، جس کو ہمیشہ قرض دیتے رہتے ہو اور رُپیہ یُوں ہی اُڑا کیوں دیتے ہو؟"

کسان نے جواب دیا "بابو اس میں تو کوئی ایسی بات نہیں ہے، جو سمجھ میں نہ آئے۔ میں اپنے باپ کا خرچ اٹھاتا ہوں۔ یہ ہوا قرض ادا کرنا۔ میں اپنے لڑکوں کو پال رہا ہوں، گویا اُن کو رُپیہ اُدھار دے رہا ہوں، پھر مجھے اپنی لڑکی کی پرورش بھی کرنی پڑتی ہے، اس پر جو کچھ خرچ ہوتا ہے وہ یوں ہی اُڑانا ہُوا۔

کسان کا معقول جواب سن کر نواب بہت خوش ہوا، اُسے کچھ رُپیہ انعام میں دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ وہ گولکنڈے کا نواب ہے۔ اس کے بعد اس نے کسان سے کہا، "تیری باتوں میں سے زیادہ باتیں بہت اچھی اور مناسب ہیں، جو تو نے مجھ سے کہا ہے، وہ کسی اور سے ہرگز نہ کہنا۔"

یہ کہہ کر نواب اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر چل دیا۔ محل میں پہنچتے ہی اس نے اپنے درباریوں کو بُلا کر کہا "آج صبح گھوڑے پر سوار ہو کر مَیں اُتر کی طرف گیا۔ گاؤں کے قریب ایک میل دُوری پر ایک کسان دکھائی دیا۔ اس کو بُلا کر میں نے پوچھا کہ کھیتی باڑی میں کچھ فائدہ ہوتا ہے یا نہیں۔ اس نے کہا، اچھی فصل ہو جانے پر اس کو اسّی رُپے کے قریب مل جاتے ہیں۔ میں نے پوچھا اس رُپے کو کیسے خرچ کرتے ہو؟ کسان نے کہا، بیس رُپے ٹیکس ادا کرنے میں خرچ ہو جاتے ہیں، بیس رُپے قرض چُکانے میں چلے جاتے ہیں، بیس رُپے اُدھار دیتا ہوں اور باقی بیس رُپے یُوں ہی اُڑا دیتا ہوں۔

وہ کسان نہ پڑھا لکھا ہے، نہ کچھ زیادہ سمجھ دار معلوم ہوتا ہے۔ کھیتی پر گزر کرتا ہے، مگر اس نے بڑی عقل مندی سے بات چیت کی۔ آپ سب تو پڑھے لکھے ہیں، اگر آپ میں سے کسی نے اس کے جواب کا صحیح مطلب بتا دیا تو میں اس کو انعام میں ایک جاگیر دُوں گا۔"

کسان کے جواب کا صحیح مطلب اُن میں سے کوئی نہ بتا سکا، پھر بھی ایک درباری نے نواب سے باتوں باتوں میں کسان کا پتہ معلوم کر لیا اور سیدھا اس کے پاس پہنچا اور اس سے کہا "سُنا ہے تم نے نواب کو ایک عجیب و غریب جواب دیا تھا، اگر تم نے مجھے اس جواب کا مطلب بتا دیا تو میں تمھیں بہت سا رُپیہ دُوں گا۔" یہ کہہ کر اس نے اشرفیوں کی تھیلی اس کے سَامنے کھول کر رکھ دی۔

تھیلی دیکھ کر کسان نے ساری باتیں صاف صاف اُسے بتا دیں۔ نواب کے پاس جا کر درباری نے کسان کے جواب کا مطلب بتا دیا۔

یہ معلوم کر کے کہ کسان نے اس کے حکم کو توڑا ہے، نواب نے کسان کو محل میں طلب کیا اور اس سے کہا "کیوں بھائی، تم نے میری بات کیوں نہیں مانی؟ میں تمھیں موت کی سزا دیتا ہوں۔ اگر تم کچھ کہنا چاہتے ہو تو کہہ سکتے ہو۔"

کسان نواب کی ان باتوں سے ذرا بھی نہیں گھبرایا۔ اس نے بہت اِطمینان کے ساتھ کہا "حضور، میں نے تو آپ کا حکم نہیں توڑا۔ میں نے تو آپ کے درباری کو اپنے جواب کا مطلب آپ کے سامنے ہی بتا دیا تھا۔ جب میں درباری کو وہ بھید بتا رہا تھا تو میرے سامنے سَو مُہریں تھیں اور ہر مہر پر آپ موجود تھے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک مہر نکالی اور اس پر بنی ہوئی نواب کی تصویر کو اُسے دکھایا۔

کسان کی عقل مندی پر نواب کو پھر تعجب ہوا۔ اس نے کہا "تم سچ کہتے ہو، مُہروں پر میں موجود ہوں۔"

اس کے بعد اس نے کسان کو اور انعام دے کر رخصت کر دیا۔

دنیا کی زبانیں، اور ان کے بولنے والے

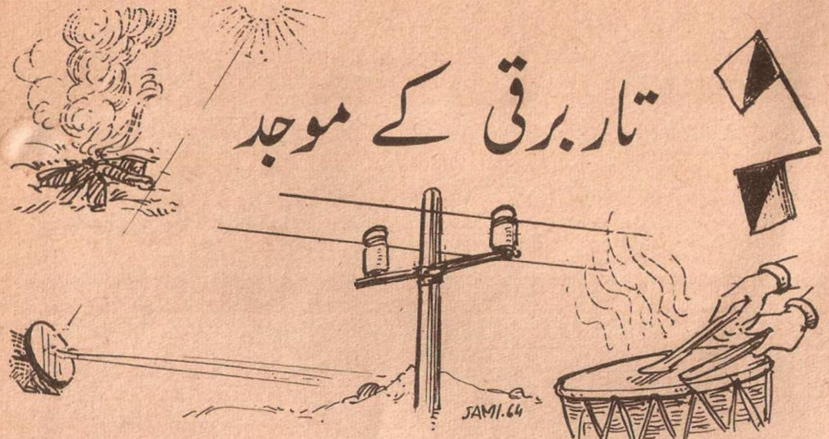
فرانسیسی اکیڈمی کے اندازہ کے مطابق دنیا میں کل ۲،۷۹۶ مختلف زبانیں بولی اور لکھی جاتی ہیں۔ انگریزی زبان ۲۷ کروڑ اشخاص اور چینی زبان ۵۰ کروڑ اشخاص استعمال کرتے ہیں۔ تقریباً ۳۳ کروڑ دس لاکھ اشخاص ہندستانی اور سولہ کروڑ ساٹھ لاکھ روسی زبانیں استعمال کرتے ہیں۔ ہسپانوی زبان ۱۰ کروڑ ۳۰ لاکھ اشخاص اور جاپانی زبان ۹ کروڑ ۷۰ لاکھ لوگ استعمال کرتے ہیں۔

دوسری زبانوں کے استعمال کی تفصیل یہ ہے:

افریقی بولیاں ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ، جرمنی زبان ۷ کروڑ ۸۰ لاکھ، فرانسیسی ۶ کروڑ ۸۰ لاکھ، پرتگیزی ۴ کروڑ ۹۰ لاکھ، اطالوی ۴ کروڑ ۴۰ لاکھ، پولش زبان ۳ کروڑ ۲۰ لاکھ اور عربی ۲ کروڑ ۹۰ لاکھ، اشخاص استعمال کرتے ہیں۔



تار برقی کے موجد



تار برقی کی ایجاد میں بہت سے لوگوں نے حصّہ لیا تھا۔ ہم مختصر طور پر اس ایجاد کی کہانی تمھیں سُناتے ہیں۔

بہت پرانے زمانے میں جب کوئی آدمی اپنے ساتھیوں کو یہ بتانے کے لیے کہ وہ کہاں ہے، آگ جلاتا تھا تاکہ اس کے ساتھی اُس آگ کے دھوئیں کو دیکھ کر اس کا پتہ معلوم کرلیں تو یہ بھی ایک قسم کی تار برقی تھی۔ فوجی لوگ جب ایک خاص انداز سے جھنڈے ہلاتے ہیں تو وہ تار برقی کا کام کرتے ہیں۔ جو شخص ایک آئینہ کی مدد سے سورج کی کرنوں کا عکس دور دور تک ڈالتا ہے تو وہ بھی تار برقی کا پرانا طریقہ استعمال کرتا ہے۔ بھارت کی مدھ پردیش ریاست میں ایک فرقہ ہے بھیج مادیا، یہ فرقہ اب تک قدیم انداز کی زندگی بسر کرتا ہے۔ ان لوگوں کی تار برقی اُن کے ڈھول ہیں۔ وہ ڈھول بجا کر اپنے فرقے کے لوگوں تک پیغام پہنچاتے ہیں، جو پیغام انھیں بھیجنا ہے، اسی کے مطابق ضربیں لگانے کے طریقے مقرر ہیں۔

یہ معلوم کرنا بہت مشکل ہے کہ کس شخص کے ذہن میں سب سے پہلے برقی تار کا خیال پیدا ہوا۔ اصل میں مختلف لوگوں نے الگ الگ اس مفید ایجاد کو پروان چڑھانے کی کوشش کی۔ خبر رسانی کے لیے برقی تار سے کام لینے کی جھلک اس لیڈنی مرتبان میں ملتی ہے، جس میں "تار لگا کر ایک شخص اسٹفن گرے نے نو سو فیٹ تک بجلی کی رَو پہنچائی۔ سر ولیم واسٹن نے ایک لیڈنی مرتبان سے

دوسرے لیڈنی مرتبان تک، جو ۲ میل کے فاصلے پر تھا، بجلی کی رَو پہنچائی۔

یہ سائنس دانوں کے لیے دل چسپ اور عجیب واقفیت ضرور تھی، مگر اس سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا۔ ۱۷۵۳ء میں ایک نامعلوم شخص نے اسکاٹ لینڈ کے ایک اخبار میں ایک مضمون لکھا، جس میں یہ رائے ظاہر کی کہ ہم اس بجلی کی رَو سے پیغامات بھیجنے کا کام لے سکتے ہیں۔ اس نے اپنے اس مضمون میں دو تجویزیں پیش کی تھیں، ایک تجویز یہ تھی کہ حروف تہجی کے ہر حرف کے لیے ایک علیحدہ تار ہونا چاہیے۔ ان تاروں کے ذریعے بجلی کی رَو دوڑائی جائے۔ اگر ہمیں حرف الف دوسری طرف پہنچانا ہے تو الف والے تار پر رَو دوڑائیں، دوسری طرف، جہاں پیغام وصول کیا جائے، یہ رَو ایک کاغذ کے ٹکڑے میں، جو وہاں اس مقصد کے لیے رکھا ہوا ہو، ہیجان پیدا کرے اور کاغذ پر حرف الف بنادے یا ایک مخصوص نشان بنادے، جو حرف الف کا قائم مقام ہو۔

دوسری تجویز یہ تھی کہ صرف ایک تار ہو، جس کے دوسرے سرے پر ایک اچھلنے والی گیند ہو، جو برقی رَو سے متاثر ہو کر جنبش کرے اور ایک گھنٹی میں جا کر لگے۔ گھنٹی کے بجنے سے ایسے نشانات ظہور میں آئیں، جو حرفوں کے قائم مقام ہوں۔ یہ بات صحیح طور پر معلوم نہیں ہوسکی کہ یہ گمنام شخص کون تھا، جس نے یہ دونوں تجویزیں پیش کی تھیں۔ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ وہ گرین وچ کے ڈاکٹر چارلس مارلیسن تھے۔ بہرطور وہ کوئی بھی ہو، تھا بڑا ذہین آدمی، کیوں کہ پیغامات پہنچانے کے لیے جو برقی اشارے آج کل مستعمل ہیں، وہ اسی طریقے کے مطابق ہیں، جو اس نے اپنی تجویزوں میں پیش کیا تھا۔

لیکن ان تجویزوں میں سے کسی کو عملی جامہ نہ پہنایا جاسکا، اس لیے کہ ان کے پاس عملی جامہ پہنانے کے ذرائع موجود نہ تھے۔ وہ اتنی مقدار میں بجلی پیدا نہیں کرسکتے تھے، جتنی مقدار میں وہ تار برقی کے لیے درکار تھی۔

اس کے بعد ہمفری ڈیوی اور مائیکل فیراڈے نے بجلی کے زبردست اسرار اور ان کے اثرات دریافت کرکے تار برقی کے راستے کی بہت سی دشواریاں دور کردیں۔ فیراڈے ایک لوہار کا لڑکا تھا۔ اس نے یہ دریافت کیا کہ ایک مقناطیس ایک ایسے تار کو برقا دیتا ہے، جس میں سے بجلی کی رَو نہ گزر رہی ہو، اس طرح ایک بڑی قوت انسان کے قبضے میں آگئی، وہ جتنی چاہے بجلی پیدا کرسکتا ہے اور اس سے جس طرح چاہے کام لے سکتا ہے، لیکن فیراڈے کی دریافت سے بھی تار برقی کو پیغام

رسانی کا ذریعہ نہ بنایا جاسکا، اس کی ایجاد کا سہرا اصل میں فرانسس رونالڈس کے سر ہے۔ رونالڈس لندن کے ایک سوداگر کا لڑکا تھا، وہ ۱۷۸۸ء میں پیدا ہوا۔ نوعمری ہی سے اس نے اس مسئلے پر غور کرنا شروع کردیا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ خود اپنے باغ میں تار کا ایک نظام قائم کرنے میں کام یاب ہوگیا۔ یہ تار آٹھ میل لمبا تھا۔ اس نے اس تار کو باغ کے چاروں طرف بہت سے چکر دے کر پھیلادیا، تاکہ تار کی ساری لمبائی باغ کے اندر ہی محدود رہے۔ اس کے بعد اس نے رگڑنے سے بجلی پیدا کرکے سارے تار کی لمبائی میں پھیلادی۔ اس کے تار کے دونوں سروں پر ایک ڈائل لگا ہوا تھا، جس میں بجلی کی مدد سے ایک ایک حرف رونما ہوتا تھا۔ جب رونالڈس کا نظام مکمل ہوگیا تو اس نے حکومت سے اس کو اختیار کرنے کی درخواست کی، مگر حکومت نے کوئی توجہ نہ کی۔ اور رونالڈس نے تار برقی سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔

تار برقی کو ظہور میں لانے والے اصل میں دو شخص تھے، ایک سر چارلس وہیٹ اسٹون، جو ۱۸۰۲ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۷۵ء میں راہی ملکِ عدم ہوا۔ دوسرا شخص سر ولیم فودرگل کک تھا، جو ۱۸۰۶ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۷۹ء میں دنیا سے رخصت ہوا۔ کک برسوں ہندستانی فوج میں رہا، اس کے بعد وہ ڈاکٹر ہوگیا۔ وہیٹ اسٹون ایک گلاؤسسٹر کے آلاتِ موسیقی بنانے والے کا فرزند تھا۔ یہ دونوں سائنس کے فدائی تھے۔ انھیں خاص طور پر بجلی کی قوت اور اس کی کارسازیوں سے بڑی دل چسپی تھی۔ وہیٹ اسٹون کا تقرر بہ حیثیت پروفیسر کے کنگس کالج میں ہوگیا۔ اس کالج کے تہ خانے میں وہ بہت اہم تجربات میں مصروف رہا اور تجربوں کے علاوہ اس نے اس کا بھی تجربہ کیا کہ ایک تار پر بجلی کے چلنے کی رفتار کتنی تیز ہوتی ہے!

کک نے اس وقت تار برقی کا ذکر سنا جب وہ یورپ کے ایک دوسرے ملک میں طب کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اس کے تیز ذہن نے فوراً اندازہ کرلیا کہ تار برقی میں اگر کام یابی حاصل ہوجائے تو ترقی کے بہت امکانات ہیں، اس لیے وہ سب چھوڑ چھاڑ کر انگلستان آگیا اور وہیٹ اسٹون کا شریک کار بن گیا۔ ان دونوں کے مل کر کام کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگلستان میں تار برقی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ سب سے پہلے یہ تار ۱۸۳۸ء میں لندن اور بلیک وال ریلوے میں لگایا گیا۔

جس زمانے میں یہ دونوں آدمی انگلستان میں تار برقی کی ایجاد میں مصروف تھے، ایک سیموئل مورس امریکا میں تار برقی کے سلسلے میں بڑی مفید خدمات انجام دے رہا تھا۔ مورس ۱۷۹۱ء میں چارلس ٹاؤن (میسیچوسیٹس) میں پیدا ہوا۔ اُسے بچپن ہی سے نقاشی اور بت تراشی کا شوق تھا

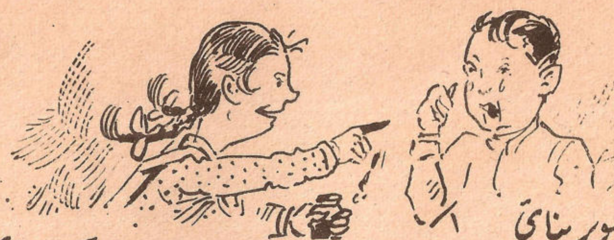
اور وہ ۱۸۱۱ء میں خاص طور پر آرٹ کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان گیا تھا۔ ۱۸۳۲ء میں وہاں سے امریکا جاتے ہوئے اس کی ملاقات ایک شخص ڈاکٹر جیکسن سے ہوئی اور دونوں میں بجلی کی قوت سے طرح طرح کے کام لینے کے متعلق گفتگو ہوئی۔

اِس گفتگو سے مورس کے ذہن میں تار برقی کا خیال پیدا ہوا اور امریکا پہنچ کر اس نے بیٹری اور مقناطیس کی مدد سے تار برقی کا پہلا آلہ ایجاد کرلیا۔ یہ ایک ایسا طریقہ تھا جس کے ذریعے خبریں خیالات کی رفتار کے ساتھ دنیا بھر میں بھیجی جاسکتی تھیں، مگر مورس کی زندگی کا یہ دَور بڑی تنگ دستی کا دَور تھا۔ ان کے پاس اتنا رُپیہ نہیں تھا کہ وہ اپنے تجربوں کے لیے ضروری سامان خرید سکیں۔ وہ تاروں کے ٹکڑے خریدتے، انھیں آپس میں جوڑتے اور اس کے بعد تار کے ایک ایک انچ حصے پر سوتی دھاگا لپیٹتے، غرض ثابت قدمی کے ساتھ مشکلات کا مقابلہ کرتے کرتے انھوں نے ۱۸۳۵ء برقی مقناطیسی تار کے آلے کا ایک ماڈل تیار کرلیا۔ اس آلے کی تکمیل میں مزید تین سال صرف کرنے کے بعد ۱۸۳۸ء میں مورس نے امریکی کانگریس سے درخواست کی کہ واشنگٹن سے بالٹی مور تک ایک تجرباتی لائن کے لیے انھیں سرمایہ دے۔ یہ درخواست مسترد کردی گئی، لیکن وہ ناامید نہیں ہوئے۔ وہ برابر سرکاری امداد حاصل کرنے کے لیے کوشش کرتے رہے اور چار سال متواتر جدّوجہد کرنے کے بعد وہ کانگریس سے ایک بِل منظور کرانے میں کام یاب ہوگئے۔ اس بِل کے مطابق انھیں تیس ہزار ڈالر کی رقم دی گئی۔

انجام کار ۲۴ مئی ۱۸۴۴ء کو مورس نے واشنگٹن سے یہ تاریخی جملہ تار برقی کے ذریعے ارسال کیا "خدا نے کیا کرشمہ دکھایا ہے"۔ چند سیکنڈ کے اندر ان کے دوست الفریڈ وَیل نے بالٹی مور سے اسی پیغام کو دہرا کر واپس بھیجا۔

اس کام یاب تجربے کے بعد امریکا میں تاروں کے کھمبے نصب کیے گئے اور ہر سمت میں تاروں کا ایک جال پھیل گیا جس نے شہروں اور قصبوں کو ملادیا اور اخباروں، ریلوں اور کاروباری اداروں نے تار برقی کا زیادہ سے زیادہ استعمال شروع کردیا۔

آج تمام دنیا میں تار پر کروڑوں پیغامات بھیجے جاتے ہیں۔ تار برقی کے نظام میں بہت ترقی ہوگئی ہے اور خود کار برقی تار یا ٹیلی ٹائپ کا عام رواج ہوگیا ہے اور خدا جانے آئندہ ترقی کے کیا کیا پہلو اس میں پیدا ہوں۔ غرض یہ ہے کہ اس عجیب و غریب ایجاد نے مورس کے نام کو غیر فانی بنادیا۔



تصویر بنائی

ظہیر ریاض



پَپّو نے تصویر بنائی
لیکن بعد میں مار بھی کھائی
بھیّا کو آوازیں دے کر
ساتھ آئی وہ اس کو لے کر
چپکے سے کمرے میں آئی
سیاہی کی اک شیشی لائی
بولی، "بھیّا بات بتائیں
آؤ! اک تصویر بنائیں"
انگلی میں پھر سیاہی لے کر
چھوٹے بھیّا کے چہرے پر
کھینچیں پہلے خوب لکیریں
امی نے بنادیں ڈاڑھی مونچھیں
خوب مزے سے لیپا پوتا
خود ہنستی تھی وہ تھا روتا
ایک نرالی شکل بنادی
گھر میں تھیں بس بوڑھی دادی
پیارے نے ان کو بتلایا
کمرے میں لاکر دکھلایا
کمرے میں جب دادی آئیں
اپنے ساتھ چھڑی بھی لائیں
پپّو نے جب سُن لی آہٹ
چھوڑ کے سب کچھ بھاگی جھٹ پٹ
دادی نے اک ڈانٹ پلائی
کانپتی کانپتی پپّو آئی
پھر پپّو نے مار بھی کھائی
اس نے کیوں تصویر بنائی

ایک بلوچی کہانی

چالیس بھائی



بہت دن کی بات ہے، بلوچستان کی اونچی اونچی پہاڑیوں میں ایک کسان رہتا تھا، جس کا نام دروس تھا۔ گو اس کے پاس بہت سے اونٹ اور مویشی تھے اور وہ خوش حال کسانوں میں شمار کیا جاتا تھا، اس کے باوجود دروس اور اس کی بیوی بہت مغموم اور رنجیدہ رہتے تھے، کیوں کہ وہ اولاد سے محروم تھے۔

دونوں میاں بیوی رات دن اولاد کے لیے خدا سے دعائیں کرتے تھے اور جو فقیر اور درویش اُن کے گاؤں سے گزرتے تھے، اُن سے بھی دُعائیں کراتے تھے۔ ایک دن ایک تھکے ماندے پیر صاحب دروس کے گاؤں سے گزرے۔ وہ مستنگ کے باغوں اور چمنوں میں آرام کرنے کے لیے جا رہے تھے۔

جب پیر صاحب دروس کے خیمے کے پاس سے گزرے تو انھوں نے زور سے کہا، "خدا کی راہ میں مجھے کچھ خیرات دو، میں بھوکا ہوں!"

دروس نے جواب دیا، "بابا! آرام سے بیٹھیے، جو کچھ خدا نے مجھے دیا ہے، میں ابھی آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔"

جب پیر صاحب کھانا کھا چکے تو دروس نے اُن سے عرض کیا، "بابا! میں اولاد سے محروم ہوں خدا سے دُعا کیجیے کہ وہ مجھے اولاد دے۔"

پیر صاحب نے چالیس سنگ ریزے لانے کا

حکم دیا۔ ان سنگ ریزوں کو انھوں نے دروس کی بیوی کی گود میں رکھا اور ہاتھ اٹھا کر خدا سے دُعا کی اور رخصت ہو کر اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔

مقررہ وقت گزر جانے کے بعد دروس کی بیوی نے بہ یک وقت چالیس لڑکوں کو جنم دیا۔

دروس خدا کے اس زبردست کرم سے پریشان ہو گیا اور سوچنے لگا اتنے سارے لڑکوں کو میں کس طرح پالوں گا۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا، "چالیس لڑکوں کو ہم کہاں سے کھلائیں پلائیں گے۔ اس مصیبت سے بچنے کی صرف ایک تدبیر ہے، ان میں سے ایک لڑکا چھانٹ کر تم اپنے پاس رکھو اور باقی ۳۹ لڑکوں کو جنگل میں چھوڑ آو۔"

چناں چہ ایک کے سوا اور سب بچوں کو جنگل میں لے جا کر چھوڑ دیا گیا اور یہ سمجھ لیا گیا کہ ان سب کو بھیڑیے اور گدھ یا اور جنگلی جانور کھا جائیں گے۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ ایک چرواہا بکریوں کے گلّے کو چُرانے کے لیے ایک پہاڑی پر لے گیا۔ وہاں اس کو ایک ہرن کی بعض عجیب حرکتوں سے کچھ شبہات پیدا ہوئے اور وہ چٹانوں میں ہرن کی عجیب حرکتوں کا سبب معلوم کرنے کے لیے پہنچا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ ایک گھاٹی کا دہانہ اوپر نیچے رکھے ہوئے پتھروں سے بند ہے۔ وہاں اس نے یہ بھی دیکھا کہ بہت سے بچے سُرخ اور زرد لالے کے پودوں میں کھیلتے پھر رہے ہیں۔

اُسے بڑا تعجب ہوا۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ بچے اس بیابان میں کہاں سے آ گئے اور انھیں جنگلی جانور کیوں نہیں کھا گئے۔

شام کو گاؤں میں جا کر اس نے لوگوں کو یہ واقعہ سُنایا۔ رفتہ رفتہ یہ خبر دروس تک بھی پہنچ گئی۔ وہ سمجھ گیا کہ سب بچے میرے ہی ہیں۔ نادم اور پشیمان وہ سیدھا اس پہاڑی پر پہنچا، جہاں وہ بچے تھے۔ اس نے دیکھا کہ بچے بہت خوش خوش پہاڑی کے درختوں میں آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔

سب بچوں کی صورتیں ایک دوسرے سے ملتی جُلتی تھیں۔ سب بہت خوب صورت تھے، مگر وہ اجنبیوں سے ڈرتے اور گھبراتے تھے۔

جب دروس نے ان سے باتیں کرنا چاہیں تو وہ بھاگ کر کھوہوں میں چھپ گئے۔ دروس ان کے کھوہوں سے نکلنے کا ایک رات اور ایک دن انتظار کرتا رہا، لیکن وہ جہاں چھپے ہوئے تھے، وہاں سے باہر نہ نکلے۔ غم گین اور افسردہ دروس ناکام اپنے گھر واپس چلا گیا۔

ماں نے، جس کا دل اپنے بچوں کو دیکھنے

کے لیے تڑپ رہا تھا، ایک مقدس بزرگ سے مشورہ کیا۔ انھوں نے اُسے یہ رائے دی کہ ان بچّوں کا ایک بھائی، جو تمھارے ساتھ رہتا ہے اسے اپنے ساتھ لے کر وہاں جاؤ، جہاں وہ سب بچے کھیلتے ہیں۔ اس بچّے کو وہاں چھوڑ کر تم کہیں چھپ جانا۔ تمھارا کام بن جائے گا۔

ماں نے مقدّس بزرگ کی ہدایت پر عمل کیا۔ سب بچّے اس کے چہیتے بیٹے کے ساتھ کھیلنے کے لیے باہر نکل آئے۔ اس منے سے اجنبی پر وہ ایسے فریفتہ ہوئے اور اس کی رسیلی آواز نے انھیں اس قدر موہ لیا کہ وہ اس کے پیچھے پیچھے ماں کے پاس چلے آئے۔ ماں ان سب سے بہت پیار کے ساتھ پیش آئی اور انھیں مٹھائی کھلائی اور بغیر کسی دقت کے ان سب کو اپنے گھر لے آئی۔

دروس کی خوشی اور مسرت کی کوئی حد نہ تھی۔ اس نے گاؤں کے لوگوں کی دعوت کی اور جشن منایا۔

ایک بشپ قدیم طرز کی ایک دکان میں بال کٹوانے گیا۔ حجام نے کرسی پیش کرتے ہوئے کہا، "تشریف رکھیے جنرل صاحب۔"

"میں جنرل نہیں ہوں۔" بشپ نے جواب دیا۔

"معاف کیجیے کرنل صاحب! میں غلطی پر تھا۔" حجام نے معذرت چاہی۔

"آپ پھر غلطی کر رہے ہیں، میں کرنل نہیں ہوں۔"

"میں معافی چاہتا ہوں کپتان صاحب۔" حجام نے پھر کہا۔

"میں کپتان بھی نہیں ہوں۔" بشپ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

آخر حجام نے پوچھا "اچھا پھر آپ کون ہیں اور کیا ہیں؟"

بشپ نے کہا "میں بشپ ہوں۔"

حجام نے بالوں کو درست کرتے ہوئے کہا "میں صحیح طور پر یہ تو نہ جان سکا کہ آپ کیا ہیں، لیکن آپ کو دیکھتے ہی یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ آپ جس ادارے سے بھی متعلق ہیں، اس کے "ہیڈ" ضرور ہیں۔

ابن رشد

کوثر چاند پوری



اِن سے ملیے، یہ دنیا کے بہت بڑے آدمیوں میں گِنے جاتے ہیں، اس لیے نہیں کہ ان کا قد اونچا تھا، بلکہ اس لیے کہ عالم بہت بڑے تھے۔ آدمی ڈیل ڈول یا عمر سے نہیں ناپا جاتا، بلکہ اس کی پیمائش اس کی عقل اور علم ہی سے ہوا کرتی ہے۔ ابن رشد اپنے زمانے کے مشہور طبیب اور فلاسفر تھے۔ حدیث اور فقہ میں بھی ان کا مرتبہ بہت اونچا تھا۔ بڑے بڑے فلاسفروں اور عالموں سے ان کی دوستی تھی۔ اسپین ایک ایسا ملک ہے، جہاں صدیوں مسلمانوں کا پرچم لہراتا رہا ہے اور بازاروں میں ان کا سکہ چلا ہے۔ اسی ملک میں ایک شہر ہے، جس کا نام ہے۔ قرطبہ۔ ابن رشد ۱۱۲۰ ہجری میں قرطبہ ہی میں پیدا ہوئے۔ پورا نام "ابو الولید محمد ابن رشد" ہے۔ جلد ہی انھوں نے طب، فلسفہ، فقہ اور حدیث پڑھ ڈالی۔ ادب اور علمِ کلام میں بھی قابلیت پیدا کر لی۔ انھوں نے ابن ماجہ اور اسپین کے دوسرے چوٹی کے فلاسفروں سے علم حاصل کیا۔

زمانہ وہ تھا جب اسپین پر الموحدین کے خاندان کا پہلا بادشاہ عبد المومن حکومت کر رہا تھا۔ ابنِ رشد کی شہرت پَر لگا کر اُڑی اور اندلس کی حدوں سے نکل کر مراکش تک جا پہنچی۔ عبد المومن کے دربار میں بھی اس کا ڈنکہ بج اٹھا۔ وقت بہت نازک تھا، مسلمان سُورما الموحدین کے پرچم تلے غرناطہ اور اشبیلیہ وغیرہ کے مورچوں پر عیسائیوں کے مقابلے میں جہاد کر رہے تھے۔ صلیب ہلال سے اور تثلیث وحدت سے ٹکرلے

رہی تھی۔ ابن رشد تلوار کا نہیں، قلم کا دھنی تھا۔ وہ چاند ستاروں کے بھید معلوم کرنے میں لگا ہوا تھا۔ آج جو لوگ سائنس کی طاقت سے چاند اور سورج تک پہنچنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، ابن رشد ان سب کا رہنما تھا۔ اسی نے دن کو چمکنے والے سورج، رات کو ٹھنڈی، دودھیا چاندنی پھیلانے والے مہتاب (چاند) اور آکاش پر جگ مگ کرتے ہوئے ستاروں سے پہلے پہل دلچسپی لی تھی۔ اسی کے نقشِ قدم پر چل کر لوگ آسمان کو پیروں میں روند ڈالنے کا حوصلہ کر رہے ہیں اور شاعر تاریخ کی زبان میں چیخ کر کہہ رہا ہے ؎

رہ گرم رو بادیۂ عشق و جنوں ہوں
جلتا ہے چراغ آج مرے نقشِ قدم سے

"عشق و جنون سے علم و دانش مراد لیجیے، یعنی میں علم و حکمت کے جنگل میں خوب تیز بھاگ رہا ہوں اور میرے تلووں کے نشانات دیے کی طرح جگمگا کر پیچھے آنے والوں کو راستہ دکھا رہے ہیں۔"

یہ کوئی شیخی کی بات نہیں ہے، بلکہ سولہ آنے سچ ہے، ابن رشد کا فلسفہ پوری چار صدی تک یورپ میں آفتاب کی طرح چمکتا رہا ہے۔

عبدالمومن لڑائی جھگڑوں سے نمٹ کر علم کی طرف متوجہ ہوا اور مشہور طبیب مروان ابن زہر اپنے بیٹے ابوبکر ابن زہر سمیت مراکش کے دربار میں آ گیا۔ ابن طفیل نے بھی ادھر ہی کا رخ کیا۔ عبدالمومن بڑا روشن دماغ اور ترقی پسند تھا۔ وہ پڑھنے پڑھانے کے پرانے ڈھنگ کو ایک دم بدل ڈالنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے ارادوں کا ساتھ دینے کے لیے دوسرے عالموں کی رائے سے ابن رشد کا انتخاب کیا۔ اس موقع پر بھی ایک مرتبہ شاعر کی زبان کو حرکت ہوئی اور وہ بول اٹھا ؎

چھانٹا ازل میں ایک تڑپتا ہوا جگر
کیا بات ہے تری نگہِ انتخاب کی

ابن رشد کو اندلس کی وزارتِ تعلیم (MINISTRY OF EDUCATION) کا قلمدان وزارت یا پورٹ فولیو (PORTFOLIO) سونپ دیا گیا۔ اس عہدے کو سنبھالنے کے بعد ابن رشد نے جو کام کیے، وہ سچ مچ سونے کے حرفوں سے لکھے جانے کے لائق ہیں۔ اس نے قصر الرشد کو دارالعلوم (UNIVERSITY) میں بدل دیا، جہاں صرف اسلامی ملکوں ہی کے طالب علم نہیں آتے تھے، بلکہ یورپین ممالک یعنی فرانس، جرمنی اور انگلینڈ تک کے طالب علم بھی اپنی علمی پیاس بجھانے آتے تھے۔ ابن رشد

نے علم کو کسی مذہب یا فرقے کی جاگیر نہیں بننے دیا، بلکہ سمندر کی طرح بہا دیا۔ مسلمان، یہودی، عیسائی غرض سب ہی اس کے شاگردوں میں شامل تھے۔

ابن رشد فلسفہ، منطق، طب، فقہ اور تفسیر پر لیکچر دیا کرتا تھا۔ یونی ورسٹی کے مختلف کمروں میں مختلف قسم کی تعلیمی چیزیں تھیں۔ ایک میں پرندوں، چرندوں اور درندوں کے ڈھانچے سجے ہوئے تھے، دوسرے میں انسانوں کی تصویریں اس ڈھنگ سے بنائی گئی تھیں کہ دل، پھیپھڑے، گردے، معدہ، آنتیں اور دوسرے اندرونی اعضا بڑی صفائی سے دکھائی دیتے تھے۔ ایک کمرہ کانچ سے تیار کیا گیا تھا۔ اس میں بہت سے تار لگے ہوئے تھے، جو مختلف سیاروں کے اندر سے ہو کر گزرتے تھے۔ ان میں چاند، سورج، مریخ اور مشتری وغیرہ تھے اور آسمان پر اپنی گردش کا سماں پیش کرتے تھے۔ اس قسم کے اور کمرے بھی تھے، ان کے اندر بھی طرح طرح کے آلات لگے ہوئے تھے۔ ایک کمرے میں ایک شیشہ لگایا گیا تھا، جو سورج کی روشنی کو جذب کر کے اس کے داغ دھبوں کو ظاہر کرتا تھا۔ عبدالمومن کے مر جانے پر اس کا بیٹا ابو یعقوب یوسف تخت پر بیٹھا۔ وہ بہت پڑھا لکھا تھا، اس نے اپنی پوری سلطنت میں مدرسوں کا جال بُن دیا۔

ابن رشد کو اس کے دوست اور استاد کے مشورے سے پھر مراکش بلا لیا گیا اور چیف جسٹس (قاضی القضاۃ) بنا دیا گیا۔ اس وقت ابن رشد جوان ہی تھا اور اشبیلیہ حکومت کا مرکز تھا۔ ابن رشد یہیں رہنے لگا۔ اس نے بڑے انصاف سے اپنے فرائض انجام دیے۔ دفتروں میں پھیلی ہوئی خرابیوں کو دور کرنے میں ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا دیا۔ وہ اتنا رحم دل تھا کہ قتل کی سزا کسی مقدمے میں مجرم کو نہ دیتا تھا۔ اگر قتل کی سزا بالکل ہی ضروری ہو جاتی تو مقدمہ کسی اور کچہری میں بھیج دیتا۔ ابن رشد نماز روزے کا بہت پابند تھا۔ نماز ہمیشہ جماعت سے پڑھتا تھا۔ وہ مذہب میں فلسفہ اور فلسفے میں مذہب کو ملا کر کھچڑی بنا دینا پسند نہ کرتا تھا۔ اس کے نزدیک آدمی کی بڑی عظمت تھی۔ وہ آدمی کو کیڑوں مکوڑوں کی طرح مرتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ انسان بہت بڑے کاموں کو پورا کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ وہ مسلمانوں میں لڑائی جھگڑوں کو بڑی نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ ابن رشد کی فطرت پڑھنے لکھنے کی طرف متوجہ تھی، لیکن عہدے کے کاموں سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ سفر کے وقت وہ

مشکل مسئلوں پر سوچ بچار کیا کرتا تھا۔ مطالعہ اس کی عادت یا ہابی (HOBBY) تھی۔ اس کی صرف دو راتیں دنیا میں آنے کے بعد ایسی گزری تھیں، جن میں وہ مطالعہ نہیں کر سکا تھا۔ ایک رات وہ جب اس کے باپ کا انتقال ہوا، دوسری وہ، جس میں اس کی شادی ہوئی۔ وقت نہ ملنے پر بھی ابن رشد نے بڑے بڑے علمی کام کیے اور بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ جو کتاب وہ لکھتا تھا، یہودی اور عیسائی اس کا ترجمہ اِٹلی، فرانس، جرمنی اور انگلینڈ کی زبانوں میں کر لیتے تھے۔

ابو یعقوب یوسف کی حکومت کے زمانے میں تہذیب و تمدن میں زبردست ترقی ہوئی۔ نہریں نکالی گئیں، پل بنائے گئے۔ ستاروں کی چال معلوم کرنے اور آوازیں سننے کے لیے رصد گاہیں بنائی گئیں۔ ابن رشد اور اس کے ساتھی پوری توجہ سے اپنی علمی کاموں میں لگے رہے۔ ابو یعقوب یوسف کی شہادت کے بعد اندلس کے تنگ خیال مولویوں نے ابن رشد کو بُری طرح گھیر لیا۔ اسے ملحد، مرتد ثابت کرنے کے لیے ہزاروں جتن کیے۔ آخر کار حکومت نے اسے دیس نکالا دے دیا۔ وہ وطن چھوڑ کر غریبی کی زندگی بسر کرتا رہا، لیکن اس نے علم کے دیے کو بجھنے نہیں دیا۔ اسی لگن سے مطالعے میں لگا رہا۔

١١٩٨ ہجری میں ابن رشد دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس نے طب، فلسفہ، فقہ، سائنس اور علم نحو پر ان گنت کتابیں اپنے پیچھے چھوڑیں۔ اب ان میں سے ٦٨ کتابیں ہی ملتی ہیں، باقی کتابوں کا پتہ نہیں۔ عیسائیوں نے اسپین فتح کرنے کے بعد مسلمانوں کی ہر یادگار کو مٹانے اور فنا کرنے میں پوری سرگرمی دکھائی، لاکھوں کتابیں جلا دی گئیں، لاکھوں سمندر میں ڈال دی گئیں۔ ان بیش قیمت علمی موتیوں ہی میں ابن رشد کی تصانیف بھی ہوں گی!

انمول ہیرے!

★ نیکی سے عمر بڑھتی ہے۔ (سرور کائنات صلعم)

★ بدخلق، بدخو اور سخت گو آدمی جنت میں داخل نہ ہوگا۔ (سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)

★ نہ دولت خواہش کرنے سے ملتی ہے، نہ جوانی خضاب لگانے سے اور نہ صحت دوا سے۔ (ابوبکر صدیق رض)

★ علم مال سے بہتر ہے، اس لیے کہ علم انسان کی حفاظت کرتا ہے۔ اس کے برعکس انسان کو مال کی حفاظت کرنی پڑتی ہے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہ)

★ عالم وہ ہے، جس کا کردار اس کی گفتار کی گواہی دے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہ)

★ ★ ★ ★



انعام

فہمیدہ اختر

سینکڑوں سال پہلے ملک بغداد میں ایک بہت ہی بڑا امیر کبیر آدمی رہا کرتا تھا، جو انتہا درجے کا کنجوس اور بخیل تھا۔ اس کی دولت میں سے ایک پیسہ بھی کھو جاتا تو اس کے واسطے موت سے بدتر تھا۔ محتاجوں، بے کسوں، غریبوں کو وہ نفرت سے دیکھتا تھا۔ ان کو ایک پیسہ دینا تو بڑی بات ہے، اُن کے پاس جو کچھ ہوتا، وہ بھی چھین لیتا تھا۔ بھلا اس سے زیادہ اور کوئی بھی ذلیل ہوگا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ وہ پانچ سو اشرفیوں کی ایک تھیلی لے کر بازار گیا۔ راستے میں اُس کی تھیلی کہیں گر گئی۔ جس وقت وہ گھر آیا، وہ اپنی پانچ سو اشرفیاں کھو چکا تھا۔ اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا، "ہائے میں لٹ گیا لوگو! میری پانچ سو اشرفیوں کی تھیلی گم ہو گئی"۔ امیر آدمی پاگلوں کی طرح چلاتا ہوا بازار کی طرف بھاگا۔ لوگ اس کی حالت دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ کنجوس آدمی ہر ایک سے پوچھتا تھا، "کیا تم نے میری تھیلی دیکھی ہے؟ اس کے اندر پانچ سو اشرفیاں تھیں، مہربانی کر کے مجھے

بتا دیجیے میں برباد ہو جاؤں گا"! لیکن ہر ایک لاعلمی ظاہر کرتا۔ اس کے حواس باختہ ہو گئے تھے۔ پانچ سو اشرفیوں کا گم ہو جانا گویا اس کے لیے بڑا حادثہ تھا۔ ہر شخص اس کنجوس اور مغرور امیر آدمی کا مذاق اُڑا رہا تھا۔ ہر جگہ چہ مگوئیاں ہو رہی تھیں۔ تمام بغداد میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ بغداد کے سب سے امیر کبیر اور دولت مند کی پانچ سو اشرفیوں کی تھیلی گم ہو گئی ہے، ہر جگہ اس کنجوس کی اشرفیوں کا ذکر ہونے لگا۔

تھوڑی دیر بعد کنجوس آدمی کا دماغ ٹھیک ہوا۔ اس نے سوچا کہ اس طرح اشرفیاں نہیں ملیں گی، مُنادی کرانی چاہیے۔ یہ سوچ کر وہ منادی کرنے والے کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ "تمام شہر میں منادی کر دو کہ جو شخص میری اشرفیوں کی تھیلی ڈھونڈ کر لائے گا، میں اُسے ایک اشرفی انعام میں دوں گا۔"

منادی والے نے کہا، جناب! محض ایک اشرفی کے لیے کوئی پانچ سو اشرفیاں کیوں کر لائے گا۔ کم از کم پچاس اشرفیاں تو دینی چاہییں۔

کنجوس نے چیخ کر کہا، "اوہ! میں تباہ و برباد ہو جاؤں گا۔ میں تو دس اشرفیوں سے زیادہ نہیں دے سکتا۔"

منادی والا ہنس کر بولا، "تو کیا آپ پندرہ اشرفیاں بھی نہیں دے سکتے؟ اس طرح تو کوئی بھی آپ کی اشرفیاں واپس نہیں کرے گا۔" آخر منادی والے نے تمام شہر میں اعلان کر دیا۔

اسی شہر میں ایک غریب کسان رہتا تھا۔ جس وقت اُس نے یہ اعلان سُنا تو اُس نے اللہ پاک سے دعا مانگی کہ اے اللہ اگر مجھے وہ تھیلی مل جائے تو میں اس امیر کو واپس کر کے انعام حاصل کروں اور کوئی اچھا سا کام شروع کر دوں۔

کسان اسی فکر میں گھر سے نکلا۔ ایک بازار سے گزر رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر تھیلی پر پڑی، اُس نے جلدی سے تھیلی اُٹھائی اور کھول کر دیکھا تو اس میں پانچ سو اشرفیاں تھیں۔ کسان تھیلی کو لے کر اس کنجوس امیر کے پاس پہنچا اور تھیلی اُس کے حوالے کی۔ کنجوس دل ہی دل میں بہت خوش ہوا اور اپنی اشرفیاں گننے لگا۔ جس وقت فارغ ہوا تو کسان نے اپنا انعام مانگا۔ کنجوس آدمی نے ناراض ہو کر جواب دیا،

"انعام کیسا"؟

کسان نے جواب دیا، "جس کا آپ نے وعدہ کیا تھا کہ تھیلی لانے والے کو پندرہ اشرفیاں انعام دی جائیں گی۔"

کنجوس نے کہا کہ میری تھیلی میں پانچ سو پندرہ اشرفیاں تھیں۔ تم نے تو خود ہی اپنا انعام نکال لیا ہے، جاؤ بھاگ جاؤ یہاں سے، ورنہ تمھیں جوتے مار کر باہر نکال دیا جائے گا۔

غریب کسان بولا، "میرا انعام دے دیجیے نہیں تو میں قاضی کے پاس جاتا ہوں۔"

کنجوس آدمی نے کہا، "جاؤ! بڑے شوق سے تمھیں ایک پائی بھی نہیں دوں گا۔" یہ کہہ کر غریب کسان کو مار مار کر نکال دیا۔

کسان سیدھا روتا ہوا قاضی کے پاس گیا۔ اس نے تمام واقعہ قاضی کو سُنایا۔ قاضی نے کنجوس کو طلب کیا اور اس سے پوچھا، "یہ کسان کہتا ہے کہ اس نے تمھاری تھیلی تلاش کر کے دی ہے اور تم نے وعدے کے مطابق اس کو انعام نہیں دیا، بلکہ مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا۔ کیا یہ سچ ہے"؟

کنجوس نے جواب دیا، حضور یہ ٹھیک کہتا ہے، لیکن میری تھیلی میں پانچ سو پندرہ اشرفیاں تھیں۔"

قاضی نے کسان سے پوچھا، "کیا یہ ٹھیک کہتا ہے"؟

کسان نے کہا، حضور! یہ بالکل جھوٹ کہتا ہے۔ مجھے جس وقت تھیلی ملی، میں نے اسی وقت واپس کر دی۔ اس میں صرف پانچ سو اشرفیاں تھیں۔"

قاضی نے کہا، "وہ تھیلی مجھے دی جائے۔"

کنجوس نے تھیلی قاضی کو دی۔ قاضی نے کسان سے پوچھا، "کیا یہ وہی تھیلی ہے، جو تمھیں ملی تھی"؟

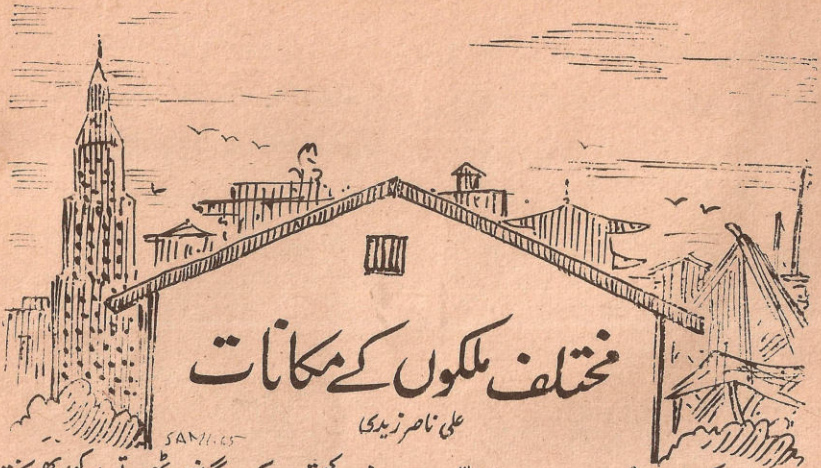
کسان نے جواب دیا، "جی ہاں"!

قاضی نے کنجوس سے کہا، "اس تھیلی میں صرف پانچ سو اشرفیاں ہی آسکتی ہیں۔ اس سے زائد کی گنجائش نہیں، اس لیے یہ تھیلی کسی اور کی ہے۔" قاضی نے یہ فیصلہ سُنانے کے بعد کسان سے کہا، "اے کسان! یہ تھیلی تمھاری ہے"

یہ سُن کر کسان کے غمگین چہرے پر مسکراہٹ آگئی، لیکن کنجوس آدمی کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا، وہ افسوس کرنے لگا کہ میں نے کیوں نہ پندرہ اشرفیاں کسان کو دے دیں، افسوس مجھے پانچ سو اشرفیوں سے ہاتھ دھونے پڑے، مگر اب کیا ہو سکتا تھا، کسان کو اس کی ایمان داری کا انعام مل گیا۔







مختلف ملکوں کے مکانات

علی ناصر زیدی

انسان کہیں بھی ہو، اُسے اپنے اور اپنے بال بچّوں کے لیے ایک مکان کی ضرورت پڑتی ہے، خواہ وہ کسی بھی ڈھنگ کا ہو۔ غیر متمدن لوگوں کے غار سے لے کر نیویارک کی فلک بوس عمارتوں تک ایک ہی مقصد کارفرما نظر آتا ہے۔ مکانات بنانے کا طریقہ دُنیا کے ہر ملک میں مختلف ہے۔

خوش حالی ہر جگہ اپنا اثر دکھاتی ہے۔ افریقہ کے تاریک جنگلوں میں بھی اور امریکا کے بارونق شہروں میں بھی۔ آب و ہوا اور آس پاس ملنے والی چیزیں بھی مکانات بنانے کے طریقوں پر اثر ڈالتی ہیں، مثلاً ناروے کا کسان لکڑی کے موٹے موٹے شہتیروں سے اپنا مکان بناتا ہے، لیکن برطانیہ کا کسان اپنے مکان کی تعمیر میں اینٹ پتھر استعمال کرنا بہتر سمجھتا ہے۔

جن لوگوں کی روزی کسی خاص جگہ سے تعلق نہیں رکھتی وہ ایک جگہ نہیں ٹھہرتے اور کہیں بھی پختہ مکان نہیں بناتے۔ خانہ بدوش اسی فہرست میں آتے ہیں۔ اُن کا مکان ان کا خیمہ ہوتا ہے۔ وہ بکری کے بالوں سے بُنا ہوا تقریباً دو فیٹ چوڑا کپڑا ان خیموں کی بناوٹ میں استعمال کرتے ہیں۔

بدوؤں کے خیمے تقریباً دس گز لمبے اور چار گز چوڑے ہوتے ہیں۔ اُن کی اونچائی زیادہ نہیں رکھی جاتی۔ خیمے کو کھڑا کرنے کے لیے چھ یا آٹھ ڈنڈے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اونٹ کے بالوں کی رسی اس کام میں مدد دیتی ہے۔ خیمہ سامنے سے کھلا ہوتا ہے اور پُشت پر ایک لمبی پٹی سے بند کر دیا جاتا ہے۔ یہ سب انتظام تیز ہواؤں سے بچنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اگر ہوا اپنا رُخ بدل لے تو پیچھے کی پٹی علیحدہ کر لی جاتی ہے اور سامنے دروازے پر لگا دی جاتی ہے۔ اس طرح خیمے

کا رُخ تیزی سے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

برٹش کولمبیا کے انڈین باشندے موسم کے اعتبار سے اپنی رہائش گاہ تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ اُن کے مکان اُن کے روزمرّہ زندگی کے عین مطابق ہوتے ہیں۔ عام طور سے وہ دریا یا سمندر کے قریب رہتے ہیں۔ اُن کی پشت پر گھنے جنگلات ہوتے ہیں۔ ماہی گیری اُن کا خاص پیشہ ہے۔

اس علاقے میں لکڑی کی افراط ہے، اس لیے تمام مکانات اسی کی مدد سے بنائے جاتے ہیں۔ ایک بستی میں چالیس مکانات تک ہوتے ہیں، جن کی لمبائیاں مختلف ہوتی ہیں۔ کسی مکان میں ایک درجن اور کسی میں سَو افراد تک قیام کرتے ہیں۔ بڑے مکانوں کی لمبائی کئی کئی سو فیٹ تک ہوتی ہے۔ ان کی بناوٹ میں اتنی موٹی لکڑی استعمال کی جاتی ہے کہ ایک مکان کئی نسلوں کے لیے کافی ہوتا ہے۔

یہ لوگ اپنے مکانات کی تعمیر میں پتھروں اور ہڈی کے اَوزاروں سے مدد لیتے ہیں۔ اُن کی قیام گاہوں سے اُن کی خوش مذاقی ظاہر ہوتی ہے۔ سُرخ اور زرد رنگ کی دیوار پر اس قرینے سے لکڑی لگاتے ہیں کہ دُور سے ہی خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ ہر مکان کے باہر لکڑی کا ایک موٹا شہتیر گڑا ہوتا ہے، جس میں بہت سے نقش و نگار کھود دیے جاتے ہیں۔ کچھ جانوروں اور انسانوں کی شکلیں بھی لکڑی میں کاٹی جاتی ہیں۔ کسی کا منھ اتنا بڑا بنا دیا جاتا ہے کہ گھر میں داخل ہونے کا راستہ اُسی منھ کے اندر سے ہوتا ہے۔

جنوبی فرانس اور اٹلی کے مکانات میں ایک برآمدہ ضرور ایسا رکھا جاتا ہے جس میں کھُلی دھوپ آسکے، کیوں کہ یہ ممالک بہت سرد ہیں۔ چھتیں چپٹی ہوتی ہیں، لیکن برطانیہ میں سلیٹ کی چھتیں ڈھلواں ہوتی ہیں تاکہ بارش کا پانی آسانی سے بہہ جائے۔

دُنیا کے شمالی ملکوں میں لکڑی افراط سے پیدا ہوتی ہے، اس لیے وہاں کے رہنے والے اسی سے اپنے مکانات بناتے ہیں۔ ناروے کے جنگلات میں رہنے والے کسان اور مزدور اپنے مکانات کی بنیاد تو پتھر سے بناتے ہیں، لیکن اُس پر باقی تمام ڈھانچہ لکڑی کا ہوتا ہے، جو وہ اپنی کلہاڑیوں سے کاٹ کاٹ کر صاف کر لیتے ہیں۔ اُن کے مکانات عام طور پر نیچے اور لمبے ہوتے ہیں۔ ان میں ایک چھوٹا سا دروازہ رکھا جاتا ہے۔ چھت درختوں کی شاخوں اور چھال سے بنائی جاتی ہے اور ڈھلواں ہوتی ہے تاکہ بارش کا پانی مکان کے اندر داخل نہ ہوسکے۔ فن لینڈ، لیتھونیا، لیٹویا اور روس میں بھی کسانوں اور غریب آدمیوں کے مکانات تقریباً اسی طرز کے ہوتے ہیں۔ شمالی کینیڈا میں لکڑی کے کیبن عام ہیں۔



مَیں نے آپ کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتی

توقیر

کسی گاؤں میں ایک غریب کسان رہتا تھا۔ اُس کا ایک لڑکا تھا۔ کسان بہت محنتی اور ایمان دار تھا۔ وہ جس زمیندار کے کھیتوں پر کام کرتا تھا وہ بہت ظالم تھا۔ کسان دن رات زمیندار کا کام کرتا رہتا تھا۔ اُس کا لڑکا بھی زمیندار کے گھر کا کام کاج کرتا تھا۔ زمیندار کا بھی ایک لڑکا تھا۔ وہ بہت شریر اور بے رحم تھا۔ ہر وقت کسان کے لڑکے کو بُرا بھلا کہتا رہتا تھا۔ رات کو جس وقت کسان کا لڑکا گھر آتا تو اپنے باپ سے کہتا، "ابّا! یہ زمیندار لوگ اتنے ظالم اور بے رحم کیوں ہوتے ہیں اور ان کے پاس اتنا رُپیہ کہاں سے آتا ہے"۔

کسان پیار سے جواب دیتا، "بیٹے! سب زمیندار لوگ ظالم اور بے رحم نہیں ہوتے، اس دُنیا میں ہر طرح کے لوگ ہیں۔ کئی زمیندار ایسے ہیں، جو غریبوں کا بہت خیال کرتے ہیں اور ان کے ساتھ بڑی ہمدردی کرتے ہیں"۔ کسان کا لڑکا کہتا، "ابّا! یہ لوگ امیر کیسے بن جاتے ہیں"۔ کسان کہتا، "بیٹا! جو محنت کرتا اور پڑھتا لکھتا ہے، وہ امیر ہو جاتا ہے"۔ لڑکا فوراً کہتا، "ابّا! میں پڑھ لکھ کر ایک دن بہت بڑا آدمی بن جاؤں گا اور غریبوں کی مدد کروں گا اور اُن سے محبت کروں گا"۔

کسان اُس کی بات سُن کر خاموش ہو جاتا، کیوں کہ وہ اسے تعلیم نہیں دلا سکتا تھا۔ کسان کے لڑکے کو پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ زمیندار کا بیٹا جب اسکول کو جاتا، کسان کا لڑکا اُس کا بستہ اُٹھا کر ساتھ جاتا۔ زمیندار کا بیٹا بڑے لاڈ پیار سے پل رہا تھا۔ کسان کا لڑکا اس کی خدمت کے لیے رہتا تھا، جب تک چھٹی نہ ہوتی وہ زمیندار کے لڑکے کے ساتھ اسکول میں رہتا۔ وہ وہاں اسکول کے دوسرے لڑکوں سے پنسل لے کر لکھنا سیکھتا۔ ایک لڑکا بہت رحم دل تھا، اس نے ایک تختی اور کتاب لاکر دے دی۔ گاؤں میں تعلیم مفت ہوتی تھی۔ فیس بھی نہیں تھی۔ جب ہیڈ ماسٹر صاحب نے دیکھا کہ اس بچے کو پڑھنے لکھنے کا اتنا شوق ہے تو انھوں نے اس کا نام اسکول کے رجسٹر میں لکھ لیا۔ سالانہ امتحان کا وقت آیا۔ کسان کا لڑکا اپنی جماعت میں اوّل آیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب بہت خوش ہوئے۔ گاؤں کا اسکول مڈل تک تھا۔ زمیندار کا لڑکا ہر سال ہر جماعت میں پاس ہوتا جا رہا تھا، مگر اس کا سبب یہ تھا کہ اُس اسکول کے تمام اُستاد زمیندار کا لحاظ کرتے تھے۔ وہ بالکل محنت نہیں کرتا تھا، بلکہ تمام دن کھیل کود میں رہتا تھا۔ کسان کا لڑکا اسکول سے پڑھ کر آتا زمیندار کے گھر کا کام کرتا اور رات کو جب گھر جاتا تو مٹی کے تیل کا چراغ سامنے رکھ کر پڑھتا، وہ مڈل میں اوّل آیا اس کو وظیفہ ملا اور شہر کے اسکول میں داخلہ مل گیا، زمیندار کا لڑکا فیل ہو گیا اور انھوں نے اس بات پر ناراض ہو کر کسان کو نکال دیا۔ کسان اور اس کا لڑکا شہر آ گئے۔ کسان محنت مزدوری کرتا اور اُس کا لڑکا پڑھا کرتا، اسی طرح دو سال گزر گئے۔ لڑکا میٹرک میں بھی اوّل آیا۔ اُس کو وظیفہ ملا، پھر اُس نے کالج میں داخلہ لے لیا۔ صبح کو کالج جاتا اور شام کو دو ایک لڑکوں کو پڑھاتا۔ اس طرح اُس نے بی اے پاس کر لیا اب اس کو ایک معقول ملازمت مل گئی، اُس نے تعلیم جاری رکھی۔ ایک دن ایسا آیا کہ وہ بہت بڑا افسر بن گیا۔ ماں باپ بےحد خوش تھے۔ وہ لڑکا بہت نیک اور شریف تھا اُس کو غریبوں سے ہمدردی اور اپنے وطن سے پیار تھا۔ وہ اپنے وطن کا سچا اور وفادار دوست تھا۔ سب کام بڑی ایمان داری اور محنت سے انجام دیتا۔ اس کے انصاف کا دُور دُور چرچا تھا۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ اُس زمیندار کا کسی سے جھگڑا ہو گیا، جس کے پاس یہ لڑکا اپنے باپ کے ساتھ بچپن میں کام کرتا

تھا۔ یہ گاؤں کی زمینوں کا جھگڑا تھا اور اس لڑکے کی عدالت میں اس کا فیصلہ ہونا تھا، جو اب حاکم تھا۔ اب یہ زمیندار اور اُن کے لاڈلے بیٹے کا نوکر نہ تھا۔ زمیندار کو جب یہ خبر ہوئی تو وہ سخت نااُمید ہوا۔ اُسے خیال تھا کہ وہ حاکم جس پر بچپن میں اُس نے اتنی سختی اور زیادتی کی تھی، اُس کے حق میں کبھی فیصلہ نہ کرے گا۔ جب یہ مقدمہ پیش ہوا تو حاکم نے زمیندار کو بڑی عزت سے کرسی پر بٹھایا۔ زمیندار شرمندہ اور حیران تھا کہ میں نے اس کے ساتھ ہمیشہ بُرا سلوک کیا اور یہ حاکم ہو کر میرے ساتھ اتنا اچھا برتاؤ کر رہا ہے۔ حاکم نے بڑے اطمینان سے سارا جھگڑا سُنا۔ دونوں طرف کے آدمیوں کی باتیں اور بیان سُنے اور اچھی طرح غور کر کے وہ فیصلہ کیا جو انصاف اور ایمان داری کے مطابق تھا اور وہ زمیندار کے حق میں تھا، کیوں کہ زمیندار کے مخالف جو فریق تھا اُس کی زیادتی ثابت ہوتی تھی۔ زمیندار کو اپنی اُمید کے خلاف یہ فیصلہ سُن کر بڑی حیرت تھی اور جب دوسرے روز وہ اس حاکم (لڑکے) کا شکریہ ادا کرنے گیا تو اس کی بڑی خاطر مدارات کر کے اُس نے زمیندار سے کہا کہ اس میں آپ کے شکریہ ادا کرنے کی بالکل ضرورت نہیں، یہ انسانیت کا فرض تھا۔ میں نے آپ کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتی صرف اپنا فرض ایمان داری سے ادا کیا ہے جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ زمیندار بہت شرمندہ ہوا اور اس نے عہد کر لیا کہ آئندہ کسی کے ساتھ بُرائی کا برتاؤ نہیں کرے گا۔ اس طرح ایک لڑکے نے خود انسان بن کر دوسروں کو بھی انسانیت سکھا دی۔

ذہنی ورزش

(جوابات)

۱- جاوید کے تھیلے خالی تھے

۲- جمیل کے چچا کا سن پیدائش ۱۸۸۱ء ہے

۳- اٹھارہ کمانیاں



عقل مند کون؟



رزاق محمود

برف باری کا موسم ختم ہو چکا تھا مگر پھر بھی کچھ برف پہاڑوں پر جمع تھی اور پگھل پگھل کر پانی کی صورت میں گلی میں ایک جھیل بناتی جاتی تھی۔ اسی گلی میں دو لڑکیاں مختلف گھروں سے نکلیں اور آپس میں مل کر کھیلنے کا پروگرام طے کیا۔ ایک لڑکی بہت چھوٹی تھی مگر دوسری اس سے قدرے بڑی تھی۔ دونوں نے صاف ستھرا لباس پہن رکھا تھا۔ ایک نے نیلا فراک پہنا ہوا تھا اور دوسری کو پھول دار زرد رنگ کا فراک بہت بھلا لگ رہا تھا۔ دونوں کے سر کے بال لال رومال سے ڈھکے تھے۔ چھوٹی لڑکی کی خواہش پانی کے چھینٹے اُڑانے کی تھی۔ جُوں ہی وہ جوتوں اور کپڑوں سمیت پانی میں کودنے لگی بڑی نے منع کیا، "دیکھو مالائشہ! پانی میں مت اُترو۔ تمھارے کپڑے خراب ہو جائیں گے اور پھر تمھاری اُمی تمھیں سزا دیں گی۔ میری طرف دیکھو۔ میں پہلے جُوتے اُتار کر فراک کو گھٹنے تک اُٹھا کر پانی میں کُودوں گی اور تم بھی ایسا کرو۔" دونوں نے جُوتے اُتار فراک گھٹنوں تک اُٹھایا اور پانی میں اُتر گئیں اور اُتر کر آہستہ آہستہ ایک دوسری کی طرف بڑھنے لگیں۔ جب پانی مالائشہ کے گھٹنوں تک پہنچ گیا تو اس نے اکولیا سے کہا، "اکولیا! پانی کتنا گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے تو اس سے خوف آنے لگا ہے۔" "ڈرو نہیں، یہ اس سے زیادہ گہرا نہیں ہو سکتا۔" اکولیا کے تسلی بخش جواب سے وہ پھر اس کی طرف بڑھنے لگی۔ جب دونوں قریب پہنچ گئیں تو اکولیا نے کہا، "دیکھنا مالائشہ دھیرے دھیرے چلو۔ چھینٹے مت اُڑاؤ!" ان الفاظ کا اکولیا کے منھ سے نکلنا تھا کہ مالائشہ پورے زور سے اوپر نیچے کودی اور پانی کے چھینٹے سیدھے اکولیا کے فراک پر پڑے اور اکولیا کے فراک پر گندے پانی کے بیل بوٹے بن گئے اور اس کے منھ پر بھی گندے پانی کے چھینٹے پڑے۔ اپنا فراک گندہ پا کر وہ غصے سے آگ بگولا ہو گئی اور مالائشہ کو مارنے دوڑی، مگر مالائشہ بھی بہت تیز تھی، وہ پانی سے نکل دوڑ کھڑی ہوئی۔ اتنے

میں اکولیا کی امّی جان ادھر آنکلیں۔ اس نے جب اپنی بیٹی کا فراک خراب دیکھا اور اکولیا کے منھ پر مٹّی کے جابجا دھبے دیکھے تو چلّائی، "کم بخت یہ کیا کرتی رہی ہے۔ کھیلنے کا بھی سلیقہ نہیں آتا۔" اکولیا نے جواب دیا،

"امّی! مالائشہ نے جان بوجھ کر میری فراک خراب کی ہے۔"

یہ سنتے ہی اکولیا کی امّی جان نے مالائشہ کو گردن سے پکڑ لیا اور زور کا طمانچہ گال پر دے مارا۔ مالائشہ نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ اس کی امّی اس کے رونے کی آواز سُن کر دوڑی دوڑی آئیں اور اکولیا کی امّی سے جھگڑنا شروع کر دیا۔ بات بڑھتی گئی اور نوبت گالی گلوچ سے ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ عورتوں مردوں کا ایک بڑا جمگھٹا لگ گیا اور لڑائی برابر بڑھتی ہی رہی۔ ایک بڑھیا نے بیچ میں آکر لڑائی ختم کرانی چاہی، مگر چیخ و پکار میں اس کی آواز دب کر رہ گئی اور کسی نے اس کی بات کی پروا نہ کی۔ جب اس نے اور زیادہ آگے بڑھ کر تُوں تُوں مَیں مَیں ختم کرانا چاہی تو دوسری عورت نے اسے نیچے گرا لیا اور اس پر چڑھ بیٹھی۔ اس دَوران وہ دونوں لڑکیاں پھر دوست بن گئیں اور اُنھیں جھگڑتے چھوڑ کر جھیل میں سے ایک نہر بنانے لگیں۔ اکولیا نے فراک اور چہرے سے دھبّے صاف کیے اور تیز نوک دار پتھر لے کر زمین کھودنے لگی۔ مالائشہ نے ایک چھوٹی سی چھڑی لی اور اس کے ذریعے کھُدی مٹّی پیچھے ہٹا کر اکولیا کی مدد کرنے لگی۔ اور اس طرح دونوں نے مل کر ایک چھوٹی سی نہر بنا لی اور اس نہر میں کاغذ کی کشتی بنا کر چھوڑ دی۔ کشتی دھیرے دھیرے چلی جا رہی تھی اور اکولیا اور مالائشہ اُسے دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں۔ جُوں ہی کشتی غوطہ کھا کر پھر تیرنے لگی تو مالائشہ کی خوشی کے مارے ہنسی چھُوٹ گئی اور زور زور سے ہنسنے لگی۔ اس کی ہنسی کی آواز بڑھیا کے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔ اس نے اکولیا اور مالائشہ کی طرف دیکھا اور پھر عورتوں اور مردوں سے کہنے لگی،

"تم لوگوں کو شرم نہیں آتی کہ ان بچّیوں کی بات پر جھگڑ رہے ہو، جب کہ وہ خود بُھلا کر پھر دوست بن گئی ہیں اور ہنسی خوشی کھیل رہی ہیں۔ وہ تم لوگوں سے کئی درجے زیادہ عقل مند ہیں۔"

بڑھیا کی آواز سنتے اور بچّیوں کو کھیلتے دیکھ کر سب نے فوراً لڑائی بند کی اور ایک دوسرے سے معافی مانگنے لگے اور پھر شرمندگی میں ہنستے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو پلٹ گئے۔



دو چاند

سائنس داں کہتے ہیں کہ وہ دن دُور نہیں جب ہم آسمان پر ایک کے بجائے دو چاند دیکھا کریں گے۔ ایک تو وہی چاند جو مدت سے دیکھتے چلے آ رہے ہیں اور دوسرا انسان کا بنایا ہوا چاند — قدرت کے بنائے ہوئے چاند کا قطر ٢١٥٨ میل ہے اور انسان کے بنائے ہوئے چاند کا قطر تقریباً ٢٣ فیٹ ہو گا۔ اُمید کی جاتی ہے کہ اس صدی کے اندر ہی یہ دوسرا چاند بن کر تیار ہو جائے گا۔

آپ پوچھیں گے یہ چاند آسمان پر ٹھہرے گا کیسے؟ اس سوال کا جواب بہت آسان ہے۔ انسان کا بنایا ہوا چاند بھی خلا میں اُسی طرح ٹھہرے گا۔ جس طرح قدرتی چاند ٹھہرا ہوا ہے، بلکہ کائنات میں کوئی چیز ٹھہری ہوئی نہیں ہے، ہر چیز گردش میں ہے۔ پوری کائنات میں ایک طرح کی کشش جاری ہے۔ زمین اور دیگر سیارے سورج کے چاروں طرف زبردست رفتار سے گھوم رہے ہیں، کیوں کہ ان سب کے درمیان کشش موجود ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر سیّارہ اپنے راستے پر قائم رہتا ہے کسی دوسرے سیّارے سے نہیں ٹکراتا۔

یہی حال چاند کا ہے۔ اس کے لیے زمین سورج کا درجہ رکھتی ہے، وہ زمین سے کہیں چھوٹا ہے، اس لیے اُس کے چاروں طرف گردش کرتا رہتا ہے۔ ایک ماہ میں ایک چکر پورا کر لیتا ہے، عربی مہینے اسی گردش پر منحصر ہیں، سائنس داں کہتے ہیں کہ کروڑوں عربوں سال پہلے چاند زمین کا ایک حصّہ تھا، اُس زمانے میں زمین پگھلا ہوا لاوا تھی۔ تیز گردش کی وجہ سے اُس کے جسم کا ایک ٹکڑا اُس سے الگ ہو گیا اور دُور نکل گیا لیکن اُس کے چاروں طرف گردش کرنے لگا۔ دُنیا والے اُسے چاند کہنے لگے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ہم بھی ایسا کوئی اسٹیشن خلا میں زمین کے چاروں طرف گھما دیں جو انسان کا بنایا ہوا ہو تو آسمان پر ایک کے بجائے دو

چاند نظر آئیں گے ۔ پہلے ہی درجنوں مصنوعی سیارے زمین کے چاروں طرف گھوم رہے ہیں لیکن وہ اتنے چھوٹے ہیں کہ آسانی سے نظر نہیں آتے ۔

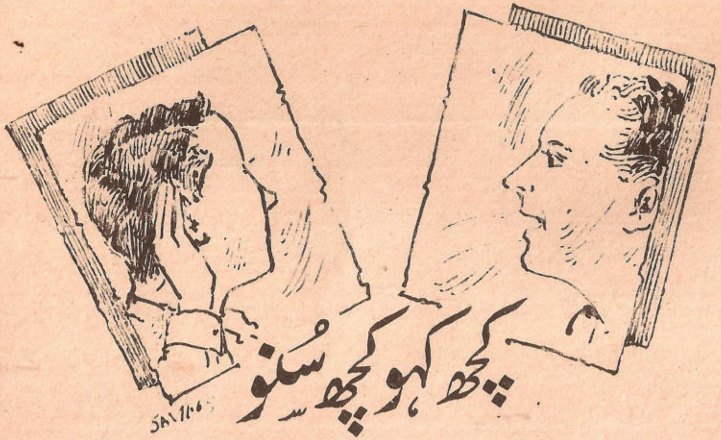
اگر ہمارے مصنوعی چاند کا قطر دو تین سو فیٹ ہو تو وہ آسانی سے زمین سے دیکھا جا سکے گا۔ وہ بھی قدرتی چاند کی طرح سورج کی روشنی منعکس کرے گا اور چمکتا نظر آئے گا ۔ اس مصنوعی چاند کے بہت سے فائدے ہوں گے ۔ سب سے بڑا تو یہ کہ دور دراز سیاروں پر جانے والے خلائی طیارے یہاں اُتر سکیں گے ، مسافر آرام کر سکیں گے اور طیارے ایندھن حاصل کر سکیں گے ۔

یہاں ایک بہترین تجربہ گاہ تعمیر کی جا سکے گی، جس میں ڈاکٹر وزن کم ہونے کی بیماریوں پر تحقیقات کر سکیں گے کیوں کہ اتنی بلندی پر زمین کی کشش خاصی کم ہو جائے گی اور ہمارا وزن ہلکا پھلکا ہو جائے گا ۔ ہیئت داں اس مصنوعی چاند پر ایک بڑی دوربین لگائیں گے ۔ یہاں سے ستاروں اور سیاروں کا مشاہدہ کرنے میں بڑی آسانی رہے گی کیونکہ یہاں کی فضا ہر قسم کے گرد و غبار سے پاک ہوگی ۔

سائنس داں اس چاند پر بیٹھ کر کائناتی شعاعوں پر تجربات کریں گے اور ریڈیو انجنیئر اسے اپنا ریلے اسٹیشن بنائیں گے ، کیمیا داں بھی اس سے کچھ کم فائدہ نہ اٹھائیں گے ۔ وہ یہاں ان حالات میں تجربات کریں گے جو زمین پر کسی صورت پیدا نہیں کیے جا سکتے ۔ آپ شاید یہ پوچھیں کہ فضا میں یہ چاند کہاں تعمیر کیا جائے گا اور کیسے ؟ تجربہ بتاتا ہے کہ اُس کا فاصلہ کم از کم اتنا ضرور ہونا چاہیے جتنا ہوا کی آخری حد کا ہے ۔ اگر اُسے اس سے کم فاصلے پر بنایا جائے گا تو ہوا کے ذرات اُس کی راہ میں حائل ہوں گے اور اس کی رفتار مدھم پڑتی چلی جائے گی ۔ آپ جانتے ہیں کہ فضا میں کوئی بھی شے آزاد ہونے کے باوجود ایک جگہ کھڑی نہیں رہ سکتی ۔ اس اسٹیشن یا چاند کو بھی زمین کے چاروں طرف گھومنا پڑے گا قطعی اسی طرح جیسے قدرتی چاند زمین کے گرد گھومتا ہے ۔ اگر اس کی رفتار اتنی کم ہو جائے کہ وہ زمین کی کشش کا مقابلہ نہ کر سکے تو نتیجہ ظاہر ہے وہ نیچے گر جائے گا اور مٹی کے کھلونے کی طرح ٹوٹ کر پاش پاش ہو جائے گا۔

یہ چاند خلا میں تیار کیا جائے گا لیکن زمین کی کشش وہاں بھی موجود ہوگی ۔ اُس کے لیے تعمیری سامان بڑے بڑے راکٹوں کی مدد سے زمین سے ہی بھیجا جائے گا۔ ماہرین کا خیال ہے کہ یہ چاند لچک دار چیزوں سے تیار کیا جائے گا جن میں نائیلون اور پلاسٹک قابلِ ذکر ہیں ۔ یہ سب سامان خلا میں ڈھیر نہیں کیا جا سکتا بلکہ اُسے زمین کے چاروں طرف گھما دیا جائے گا تاکہ نہ وہ نیچے گرے اور نہ دُور بھاگے ۔

جب ضرورت بھر تمام سامان خلا میں پہنچ جائے گا تو خلائی انجنیئر چھوٹے چھوٹے راکٹوں میں بیٹھ کر وہاں پہنچیں گے اور اس ساز و سامان کو جمع کریں گے ، خلا میں حرکت کرنے کے لیے وہ جیٹ پستول استعمال کریں گے ۔



کچھ کہو کچھ سنو

ابراہیم محمد آگریا ۔ کراچی

س : دنیا کا سب سے بڑا ملک کون سا ہے ؟

ج : رقبے کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا ملک برازیل ہے اور آبادی کے لحاظ سے چین ہے ۔

صہیب احمد صدیقی عامر ۔ لاہور

س : کیا میں ہمدرد نونہال چھ ماہ کے لیے جاری کرا سکتا ہوں ؟

ج : ہمدرد نونہال چھ ماہ تک کے لیے جاری نہیں کیا جاتا، بلکہ کم از کم ایک سال کے لیے جاری ہو سکتا ہے ۔

لیاقت علی خاں ۔ میرپور خاص

س : گھر بیٹھے ہمدرد نونہال حاصل کرنے کی ترکیب ؟

ج : صرف آٹھ روپے بھیج کر ہمدرد نونہال کے سالانہ خریدار بن جاؤ ، رسالہ ہر ماہ تمھیں گھر بیٹھے ملتا رہے گا ۔

حسین احمد ۔ روہڑی

س : شرارت اور بدتمیزی میں فرق ؟

ج : بزرگوں کی ناراضی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کون سی بات بدتمیزی میں شمار ہوتی ہے ۔

محمد رمضان الوری ۔ کراچی

س: سب سے پہلے فٹ بال کہاں کھیلا گیا؟

ج: فٹ بال کا کھیل سب سے پہلے برطانیہ کے جزیروں میں کھیلا گیا تھا۔

مختار احمد ۔ ڈیرہ اسماعیل خاں

س: بھیا، دُنیا کا سب سے بڑا عجائب گھر کہاں ہے؟

ج: برٹش میوزیم دنیا کا سب سے بڑا عجائب گھر ہے۔

عبدالخالق ہارون ۔ گوادر

س: پاکستان کی مشہور بندرگاہیں کون کون سی ہیں؟

ج: کراچی، چٹاگانگ، گوادر، چالنا

ذہینہ قریشی ۔ راول پنڈی

س: حلقۂ دوستی کا فارم بھیجے کافی دن ہو گئے مگر اب تک شائع نہیں ہوا۔ وجہ؟

ج: حلقۂ دوستی کا فارم ملتے ہی ہم اسے نمبر وار رکھتے جاتے ہیں۔ پھر جب اس کا نمبر آتا ہے تو شائع ہو جاتا ہے۔

شاہدہ حمید ۔ کراچی

س: دُبلا ہونے کی کوئی ترکیب تو بتاتیے؟

ج: کھیل، ورزش اور پڑھائی میں محنت سے ضرورت سے زیادہ موٹاپا کم ہو جائے گا۔

محمد اسلم صدیقی ۔ ڈیرہ غازی خان

س: قائدِ اعظم کے بعد پاکستان کا گورنر جنرل کون تھا؟

ج: پاکستان کے دوسرے گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین مرحوم تھے۔

خورشید نہال ۔ چاٹگام

س: اگر میں نونہال کا خریدار بن جاؤں تو فائدہ؟

ج: ہر مہینے بازار سے رسالہ خریدنے کی تکلیف نہیں کرنا پڑے گی، ڈاکیہ خود تمھارا نونہال تمھیں گھر بیٹھے دے جایا کرے گا۔

بشریٰ مقبول صدیقی ۔ کندیاں

س: بھائی جان چاند کی دوسری طرف کیا ہے؟

ج: ابھی ہم چاند پر نہیں گئے، جب جائیں گے تو وہیں سے خط لکھ کر تمھیں بتا دیں گے۔

عبدالستار عادل ۔ گوادر

س: مرزا غالب کا اصل نام کیا تھا؟

ج: غالب کا اصل نام مرزا اسد اللہ خاں تھا۔

ریاض احمد شہزاد ۔ حیدر آباد

س: پاکستان کی کل آبادی کتنی ہے؟

ج: نو کروڑ اڑتیس لاکھ اکتیس ہزار نو سو بیاسی!

سلیم رضا ۔ کوئٹہ

س: اب عربی کے بعد آپ بنگالی کا سبق شروع کیوں نہیں کر دیتے؟

ج: بنگلہ زبان کا سیکھنا یقیناً مفید ہے۔ اس تجویز کے متعلق دوسرے نونہالوں کی رائے کیا ہے؟

نونہال ادیب



توتے کی آزادی

صابرہ
قلعہ دیدار سنگھ



نصرت، نصرت ادھر آؤ ایک چیز دکھاؤں؛ اسلم بھیا نے زور سے پکارا تو میں سوال ادھورا چھوڑ کر ادھر کو لپکی ۔۔۔ اسلم بھیا کے ہاتھ میں ایک خوب صورت سا پنجرہ تھا۔ اور پنجرے میں ایک خوب صورت سا توتا جو بڑی بے بسی سے گردن ایک طرف جھکائے چپ چاپ سا بیٹھا تھا۔ ہائے بھیا اس بے جان کو کیوں قید کر رکھا ہے۔ مجھے بے اختیار توتے پر ترس آ گیا۔ دل چاہتا تھا پنجرے کا دروازہ کھول کر اُسے اڑا دوں۔ میں نے پنجرے کی طرف قدم اٹھایا ہی تھا کہ اسلم بھیا کا مارے غصے کے رنگ سُرخ ہو گیا۔ چلا کر بولے، ”دیکھو نصرت کی بچی، اگر تُو نے میرے توتے کو ہاتھ لگایا تو ایسی پٹائی کروں گا کہ یاد ہی کرے گی۔ اور میں کانپ کر پیچھے ہٹ گئی۔ اسلم بھیا نے پنجرے کا دروازہ کھول کر اس میں

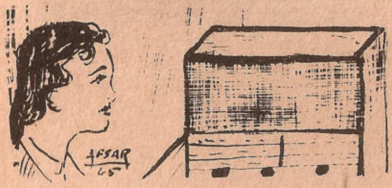
کھانے پینے کی چیزیں رکھ دیں، مگر توتے نے کسی طرف دھیان نہیں دیا۔ دو دن بیت گئے، مگر توتے نے کچھ نہیں کھایا نہ پیا۔ جب آسمان پر کھلی فضاؤں میں اڑتے ہوئے پرندے اسے نظر آتے تو وہ چلّا چلّا کر پنجرے کی سلاخوں کے ساتھ اس شدّت سے ٹکریں مارتا کہ میرا دل بے چین ہو جاتا۔ کئی مرتبہ میں اُسے اڑانے کے ارادے سے آگے بڑھی، مگر ہر مرتبہ اسلم بھیّا کا جملہ کانوں میں گونج گیا۔ "ایسی پٹائی کروں گا کہ یاد ہی کرے گی" اور میں کانپ کر پیچھے ہٹ جاتی۔ اگلے روز اسلم بھیّا کو ایک نئی ہی بات سوجھی کہنے لگے کہ نفرت تم پنجرے کے پاس بیٹھو میں قینچی لا کر اس کے پر کاٹتا ہوں، پھر اُسے گھر میں چھوڑ دیں گے۔ وہ تو قینچی لینے چلے گئے اور میں پنجرے کے پاس بیٹھ کر توتے کو دیکھنے لگی۔ آسمان پر کئی توتے شور مچاتے ہوئے اڑتے جا رہے تھے۔ توتے کی نظر پڑی تو وہ ایک دم چلّا چلّا کر ٹکریں مارنے لگا۔ جیسے اُن کو اپنی مدد کے لیے بلا رہا ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بے چارے کو اپنا گھر کس قدر یاد آرہا ہوگا۔ اپنی اُردو کی کتاب میں پڑھی ہوئی اقبال رح کی نظم یاد آگئی۔

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ
وہ جھاڑیاں چمن کی وہ میرا آشیانہ

سیڑھیوں پر اسلم بھیّا کے چڑھنے کی آواز آرہی تھی، جو قینچی لے کر آرہے تھے۔ تاکہ توتے کے پر کاٹ سکیں۔ میرے پاس سوچنے کے لیے وقت نہ رہا میں نے فوراً آگے بڑھ کر پنجرہ کھول دیا۔ توتا ایک لمحہ کے لیے ٹھٹکا، پھر اس نے ایک جست بھری اور تیزی سے کھلی فضا میں اڑنے لگا۔ اسلم بھیّا کے قدموں کی آواز میرے قریب آرہی تھی، لیکن مجھے اس وقت کسی کا ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ میرے دل سے ایک بھاری بوجھ اُتر چکا تھا۔ اور میں دور اپنے آشیانے کی طرف جاتے ہوئے توتے کو دیکھ رہی تھی، جو آہستہ آہستہ میری نظروں سے غائب ہو گیا۔

انعام

منوّر پروین
کراچی



امتحان سر پر تھے، میں تھی کہ ہر وقت کمرہ بند کر کے کتابوں کا کیڑا بنی رہتی۔ دوسرے میرا کمرہ دوسری منزل پر کونے میں تھا، جہاں پر بہت کم شور کی آوازیں آتی تھیں۔ میں ہر وقت کتابوں میں لگی رہتی۔ یہاں تک کہ دیوار پر لگی ہوئی گھڑی نے ایک بجا دیا اور مجھے کھانے پینے تک کا ہوش نہ تھا کہ اچانک دستک ہوتی ہے اور میں چونک جاتی ہوں اور دروازہ کھول کر دیکھتی ہوں تو دروازے پر سہیل کھڑا ہوا ہوتا ہے۔ بڑے ہی پیار بھرے لہجے میں کہتا ہے۔ باجی جان امّی کہہ رہی ہیں آپ کھانا نہیں کھائیں گی۔ میں نے اُسے پیار کیا اور نیچے کی منزل میں اتر آئی۔ کھانے کے کمرے میں گئی تو دیکھا سب کھانا کھا رہے ہیں۔ میں نے ہاتھ منھ دھویا اور ایک کرسی پر بیٹھ کر جلدی جلدی الٹا سیدھا کھانا کھایا اور مسواک کر کے اپنے کمرے میں آگئی۔ باقی سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں جا کر سو گئے۔ مجھے تو امتحان کی ہیبت سوار تھی۔ میں نے کتابیں سنبھالیں اور پڑھنے لگی۔ میرا میٹرک کا امتحان تھا اور سب گھر والوں کا خیال تھا کہ اگر میں پاس بھی ہو گئی تو تھرڈ ڈویژن سے۔ بس میں نے سب کے ارادوں پر پانی پھیرنے کے لیے دن رات محنت کی۔ گیارہ مئی سے ہمارے امتحان شروع ہیں۔ پہلا پرچہ انگلش کا ہے۔ ابّا جان کہتے ہیں۔ اگر میں نے فسٹ کلاس فسٹ ڈویژن لی تو میں تمھیں انعام دوں گا۔ امّی جان کے قول کے مطابق مجھے گھڑی ملے گی۔ بھائی جان کا وعدہ ہے کہ پارکر پن دیں گے۔ بس جی بس میں پاگل ہو گئی۔ اتنی بہت ساری چیزوں پر میں یہ بھی جانتی تھی کہ ان سب نے یہ چیزیں اس لیے رکھی ہیں کہ اُنھیں یقین ہے کہ میں بڑے نمبروں سے کامیاب ہوں گی۔ میں نے اپنے تمام دوستوں کو تین ماہ سے الوداع دے دی ہے اور ہر وقت کتابوں میں لگی رہتی ہوں۔ آج دس مئی ہے کل ہمارا پہلا پرچہ ہے۔ اللہ اللہ کر کے ہمارا امتحان ختم ہوا۔ دو ماہ کے انتظار کے بعد نتیجہ آیا۔ میں ہر روز مقامی خبریں سنتی۔ جیسے ہی میں نے ریڈیو کھولا۔ یہ سن کر میرا دل دھک دھک کرنے لگا کہ ریڈیو پر کوئی کہہ رہا تھا کہ آج ثانوی بورڈ نے میٹرک کے امتحانات کے نتائج کا اعلان کر دیا ہے۔ رول نمبر ۱۰۰۵ جامعہ اسلامیہ گرلز سیکنڈری اسکول کی طالبہ منور پروین اوّل رہیں۔

میں نے اتنا ہی سنا تھا کہ ریڈیو بند کر دیا۔ میں خوشی سے دیوانی ہو گئی۔ سب لوگ حیران تھے۔ بھائی جان جلدی سے اخبار لے آئے۔ سرخی پر میرا نام تھا۔ اور دائیں جانب میرا فوٹو تھا۔ میں نے ایک ہزار میں سے ۷۵۹ نمبر حاصل کیے۔ ابا جان کو آفس میں پہلے ہی فون مل چکا تھا۔ وہ بھی دیوانہ وار گھر آئے اور مجھے بہت پیار کیا۔ بس پھر کیا تھا سب طرف سے میری طرف مبارک باد برسنے لگی۔

امی جان نے گلے لگا کر پیار کیا، پھر مجھے رفتہ رفتہ سب کے انعام بھی مل گئے۔

اور سب سے بڑا انعام جو مجھے ملا تھا، وہ میرا وظیفہ تھا، جو کہ بورڈ کی طرف سے مجھے ملا تھا۔

بچو! اس سے پتہ چلا کہ مسلسل محنت اور کارروائی ایک دن ضرور رنگ لاتی ہے۔

نیک عمل

یوسف گوڈیل شفا
کراچی



بوڑھی ماں کا لال، آنکھ کا نور، جگر کا ٹکڑا صرف ایک رمیش ہی تو تھا، جو جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر شہر میں بیچ کر کچھ کھانے پینے کا سامان لے آتا تھا۔ رمیش کی بوڑھی ماں اپنی جھگی کے چٹائی سے بنے ہوئے دروازے سے ٹیک لگا کر اس کے آنے کا انتظار کرتی اور جب اس کا لال دور پگڈنڈی سے اس کی بوڑھی آنکھوں کو نظر آتا تو وہ خوشی سے اس کا استقبال کرنے دور تک جاتی اور اس کے ہاتھ سے کلہاڑی اور کھانے کی چیزیں تھام لیتی۔ پھر دونوں ماں بیٹے اپنی ٹاٹ اور چٹائی سے بنی ہوئی جھگی میں چلے جاتے۔ ماں جو کچھ

گھر میں ہوتا یا بیٹا لاتا اسے پکا لیتی اور ٹاٹ کے ٹکڑے پر بیٹھ کر کھاتے اور خدا کا شکر ادا کرتے۔

ایک تپتی دوپہر کو رمیش شہر میں لکڑیاں بیچ رہا تھا۔ وہ ایک تنگ گلی سے گزرا اس نے دیکھا تین لڑکے جوا کھیل رہے تھے۔ رمیش لکڑیوں کا گٹھا کاندھے سے اتار کر اس کھیل کو دیکھنے لگا۔ جوا کھیلتے کھیلتے دو لڑکوں میں لڑائی بھی ہوئی۔ یہ دیکھ کر رمیش آگے بڑھا اور ان لڑکوں کو الگ کیا اور ان سے کہا کہ تم جوا کھیلنے میں اپنا قیمتی وقت اور پیسے کیوں گنواتے ہو۔ اگر میری بات مانو تو تم حلال کے ہزاروں روپے کما سکتے ہو۔" تینوں لڑکے اس کی بات سننے کے لیے متوجہ ہو گئے۔

رمیش نے ایک لڑکے جس کا نام سراج تھا، پوچھا، "تمھاری امی تمھیں کتنا جیب خرچ دیتی ہیں۔" سراج نے کہا، "ایک روپیہ روزانہ!" یہ سن کر رمیش نے کہا، "دیکھو دوستو، میری ماں مجھے روز ایک آنہ جیب خرچ کے لیے دیتی ہیں۔ جسے میں جمع کرتا ہوں اور مہینے میں ان سب پیسوں سے چند اچھی اچھی کتابیں خرید کر اس کا مطالعہ کرتا ہوں اور اچھی باتوں پر عمل کرتا ہوں۔ اگر تم بھی ایسا ہی کرو گے تو مستقبل میں اپنی منزل پا لو گے، پھر تمھیں در در کی ٹھوکریں نہیں کھانی پڑیں گی اور نہ تم کسی کے آگے ہاتھ پھیلاؤ گے۔ یہ کہہ کر رمیش لکڑیوں کا گٹھا اٹھا کر گلی گلی آواز لگاتا ہوا کہیں غائب ہو گیا۔

ادھر تینوں دوستوں نے جوا کھیلنے سے توبہ کر لی اور رمیش کی بتائی ہوئی باتوں پر عمل کرنا شروع کر دیا۔

خدا کسی کی محنت کو رائیگاں نہیں جانے دیتا۔ تینوں دوستوں نے پڑھ لکھ کر وہ نام پیدا کیا کہ آج لوگ انھیں ڈاکٹر، وکیل اور بلند پایہ کے شاعر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

رمیش بھی ایک بہت مشہور ادیب اور ایک اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ وہ اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا کہ اس وقت تین جانے پہچانے آدمی دفتر میں داخل ہوئے۔ رمیش نے ان کو پہچان لیا۔ یہ وہی تین لڑکے تھے، جو سالوں پہلے جب کہ رمیش شہر میں لکڑیاں بیچنے جاتا تھا۔ جوا کھیلتے ملے تھے۔ ان تینوں نے رمیش

کا شکر یہ ادا کیا کہ اس نے ہمیں اندھیرے سے نکال کر اجالا دکھایا۔ گمراہی سے صراط مستقیم دکھایا۔

انھوں نے رمیش کو تین تھیلیاں پیش کیں۔ رمیش نے بہتیرا منع کیا، لیکن وہ نہ مانے۔ رمیش نے ان کو کئی دن اپنا مہمان رکھا اور رخصت کیا۔

ان کے جانے کے بعد رمیش نے وہ تھیلیاں کھولیں تو اس میں سے تین پرچیاں نکلیں۔ ایک پر لکھا تھا،

"نیک عمل اچھا، بد عمل بُرا"

دوسری پر لکھا تھا،

"علم ہی دولت کا خزانہ ہے"

تیسری پر لکھا تھا،

"علم کی روشنی سے دوسروں کے چراغ جلاؤ۔"

اور پانچ ہزار رُپے تھے۔ رمیش نے ان رُپوں کو اخبار کی ترقی میں لگا دیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں رمیش کے اخبار نے بہت ترقی کی اور اس کا اخبار ملک کے بڑے اخباروں میں گنا جانے لگا۔

بچّو! تم بھی اچھّی اچھّی باتوں کو غور سے پڑھو اور سنو پھر ان پر عمل کرنے کی پوری پوری کوشش کرو۔

قسمت کا ہیر پھیر

غلام حسین ہاشمی
پنڈی گھیب



جب سلطان محمود غزنوی نے گجرات کے مشہور مندر سومنات کو فتح کیا اور اس علاقے کے بڑے بڑے خزانے لوٹے تو وہ گجرات کی دولت و خوب صورتی پر اتنا فریفتہ ہو گیا تھا کہ اس نے ہمیشہ وہاں رہنے اور گجرات کو اپنا دارالخلافہ بنانے کا ارادہ کیا، مگر بڑے بڑے سردار محمود کے اس ارادے پر متفق نہ تھے۔ اس لیے محمود نے ارادہ کیا کہ وہ کسی راجہ کو گدی پر بٹھا جائے، جو اس کے نام پر راج کرے اور سالانہ خراج اس کے پاس بھیجتا رہے۔

کافی تلاش کے بعد اسے ایک نیک، عقل مند اور حکومت کرنے کے قابل شہزادے کا پتہ ملا۔ جس

کا نام دالبشلیم تھا۔ وہ ان دنوں جنگلوں میں سنیاسی بن کر رہتا تھا چناں چہ سلطان نے اسے بلا بھیجا اور اس علاقے کی حکومت اسے سونپی۔

دالبشلیم نے حکومت اس شرط پر منظور کی کہ اس علاقے میں ایک طاقت ور سردار میرا ہی ہم نام ہے۔ اگرچہ وہ میرا بھتیجا ہے، مگر میرا جانی دشمن ہے۔ اس کے پاس بہت زیادہ لشکر ہے۔ اس لیے مجھے اس سے خوف آتا ہے۔ جب وہ سنے گا کہ میں بادشاہ بن گیا ہوں تو وہ میرا خاتمہ کیے بغیر چین سے نہیں بیٹھے گا۔ اس لیے میری درخواست ہے کہ سلطان اس کو قیدی بنا کر اپنے ساتھ لے جائیں تاکہ وہ مجھے تکلیف نہ پہنچا سکے۔

یہ سن کر محمود نے راجہ دالبشلیم پر چڑھائی کی۔ اور اس کا علاقہ فتح کر کے اسے قید بھی کر لیا اور دالبشلیم سنیاسی سے کہا کہ "اب تم اسے قتل کرا سکتے ہو" سنیاسی نے جواب دیا کہ ہمارے ملک میں کسی قیدی بادشاہ کو قتل نہیں کیا جاتا، بلکہ اسے ایک صندوق میں جس میں قیدی کو کھانا پہنچانے کے لیے چھوٹا سا سوراخ ہوتا ہے، اس میں قید کر کے شاہی تخت کے نیچے رکھتے ہیں۔ لیکن میں ابھی اپنے دشمن کو اس طرح قید نہیں کرنا چاہتا۔ فی الحال سلطان اسے اپنے ساتھ غزنی لے جائیں۔ جب میں مکمل طور پر تخت پر بیٹھ جاؤں گا۔ تو ملکی رسم کے مطابق اسے اپنے تخت کے نیچے صندوق میں بند کر دوں گا چناں چہ سلطان نے ایسا ہی کیا۔ وہ سنیاسی کو سومنات کے تخت پر بٹھا کر اور قیدی راجہ کو ساتھ لے کر غزنی چلا گیا۔

ایک دو سال کے بعد دالبشلیم سنیاسی نے قیدی راجہ کو غزنی سے لانے کے لیے اپنے آدمی بھیجے۔ چناں چہ سلطان نے قیدی راجہ کو ان کے حوالے کر دیا۔ ملک کی یہ رسم تھی کہ راجہ کسی بھی قیدی کی آمد پر اپنے درباریوں کے ساتھ ایک منزل آگے قیدی کے استقبال کے لیے جایا کرتا تھا۔ اور قیدی کے سر پر ہاتھ منھ دھونے کا برتن رکھ کے اسے راجہ کے گھوڑے کے آگے محل تک لایا جاتا۔ جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ وہ اب بادشاہ کا غلام ہے۔

چناں چہ اس رسم کے مطابق راجہ دالبشلیم ایک منزل آگے قیدی راجہ

دالبشلیم کی طرف روانہ ہوا۔ قیدی راجہ ابھی بہت دور تھا۔ اس لیے اکتا کر راجہ اور اس کے درباریوں نے شکار کھیلنا شروع کر دیا۔ راجہ اسی اثنا میں درباریوں سے الگ ہو کر ایک درخت کے نیچے آرام کرنے کے لیے سو گیا۔ اور مکھیوں سے محفوظ رہنے کے لیے اپنے چہرے پر لال رنگ کا ریشمی رومال ڈال لیا۔

اسی دوران کوئی باز اڑتا ہوا آیا۔ اس کی نظر لال رومال پر پڑی۔ سمجھا کہ گوشت ہے۔ چناں چہ رومال پر جھپٹا مار کر اسے اٹھانا چاہا، لیکن اس کا پنجہ راجہ کی آنکھ پر پڑا اور وہ جاتی رہی۔

راجہ درد سے چلایا۔ درباری آئے اور مرہم پٹی کی۔ اس وقت ملک کی رسم کے مطابق ایسا شخص بادشاہ نہیں بن سکتا تھا، جس کے جسم پر کوئی نقص ہو اور کانا آدمی خاص کر بدقسمت خیال کیا جاتا تھا۔ اس لیے یہ راجہ اب حکومت کے قابل نہ تھا۔ ٹھیک اسی وقت درباری قیدی راجہ دالبشلیم کو ساتھ لے کر غزنی سے واپس آگئے۔ یہ دالبشلیم خوب صورت اور ہر قسم کے جسمانی نقص سے بری تھا۔ اس کے علاوہ وہ شاہی خاندان کا شہزادہ تھا۔

سنیاسی راجہ کے بعد اور کوئی شخص تخت کا حق دار موجود نہ تھا۔ اس لیے درباریوں، افسروں اور سپاہیوں نے قیدی راجہ، جو غزنی سے آیا تھا، تخت پر بٹھا دیا۔

جب یہ فیصلہ ہو چکا تو قیدی راجہ کو شاہی لباس اور شاہی تاج پہنایا گیا۔ اور وہ گھوڑے پر سوار ہوا۔ اور دوسرے دابشلیم کو، جو پہلے سنیاسی تھا۔ سر پر برتن رکھ کر محل تک اس کے آگے آگے چلنا پڑا۔

چناں چہ سنیاسی دابشلیم کو تخت کے نیچے اس صندوق میں قید کر دیا گیا، جو اس نے اپنے دشمن کے لیے تیار کرایا تھا۔

اور وہ ہمیشہ اس میں ہی قید رہا۔

قسمت کا دستور نرالا ہوتا ہے۔

*

تمہارا خیال ہے

لطیفے

جنوری ۱۹۶۵ء کا شمارہ نظر سے گزرا۔ اس دفعہ پرچے میں سب سے زیادہ قابلِ تعریف اور پیاری چیز "پیراشوٹ کس طرح ایجاد ہوا" تھی، بار بار پڑھی بہت پسند آئی۔ چیختے بھاگتے جنگل، روزہ، بادشاہ بلی بن گیا بہت پسند آئیں، میری طرف سے مصنف حضرات کو مبارک باد قبول کرنے کی دعوت دیں۔ باقی افسوس کہ آپ اس رسالے میں زیادہ تعداد میں لطائف نہیں لکھتے، زیادہ لطائف بھی لکھا کریں تاکہ رسالہ اور مقبول ہو جائے۔

منظور احمد ظفر۔ لائلپوری

سرورق

جنوری کے شمارہ کو پڑھ کر تو طبیعت خوش ہو گئی۔ سرورق بھی بڑا شاندار تھا۔ ہر ماہ کی طرح اب کے مضامین بھی بڑے مزے دار تھے۔

خدا ہمارے دل پسند اور پیارے رسالے "ہمدرد نونہال" کو دن دونی رات چوگنی ترقی عطا کرے۔ ویسے بھی ہمارا رسالہ ترقی کی ہموار راہ پر بڑی تیزی سے گامزن ہے۔

شیخ اطہر احمد تخلص۔ کراچی

باقاعدہ مطالعہ

میں نے ماہ جنوری ۱۹۶۵ء کا "ہمدرد نونہال" پڑھا، بے حد پسند آیا۔ مضامین سب قابل تعریف ہیں۔ سرورق دیدہ زیب اور حسین ہے۔

میں ہمدرد نونہال اور دوسرے رسائل کا مطالعہ اگست ۱۹۶۴ء کے ہمدرد نونہال سے پیشتر بے قاعدگی سے کر رہا تھا،

مگر اگست ۱۹۶۴ء کے "ہمدرد نونہال" پڑھنے کے بعد یقین جانیے، ہمدرد نونہال سے اس قدر دل چسپی اور محبت ہو گئی ہے کہ میں نے ہمدرد نونہال باقاعدہ پڑھنا شروع کر دیا ہے اور ہر ماہ کے ہمدرد نونہال کا انتظار بے چینی سے کرتا ہوں، ہمدرد نونہال واقعی قابل تعریف ہے، اور معلومات کا خزانہ ہے، اتنا اچھا رسالہ شائع ہونے پر مجھے فخر ہے اور میری طرف سے آپ اور جناب حکیم محمد سعید صاحب کو مبارک باد۔

سید انصار حسین رضوی۔ حیدر آباد

بادشاہوں کے حالات

جنوری کا رسالہ ملا ٹائیٹل بہت ہی پسند آیا۔ کہانیاں، نظمیں، معلوماتی مضامین غرض سارے مضمون بہت ہی زیادہ اچھے تھے۔

میرے پاس وہ الفاظ نہیں جس سے میں آپ کے رسالے کی تعریف کروں۔ وہ دن دور نہیں جب یہ رسالہ اپنی نوعیت کا واحد رسالہ ہوگا۔

ہماری بھی دعا ہے کہ یہ رسالہ دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرے۔ آمین

اگر اس میں بادشاہوں کے حالات کا اضافہ کر دیا جائے تو کیا اچھا رہے، بچوں کا کیا خیال ہے؟ یہ آپ بچوں سے پوچھ لیں۔

محمد اظہر جاوید۔ رحیم یار خاں

ایک چیز کی کمی

میں کافی عرصہ سے ہمدرد نونہال کا مطالعہ کرتا آ رہا ہوں، ویسے یہ رسالہ واقعی میں بہت عمدہ ہے، لیکن اس میں ایک چیز کی کمی ہونے کی وجہ سے بڑا افسوس ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ نونہالوں کی ذہانت کا امتحان لینے کے لیے اور ان کی دل چسپی بڑھانے کے لیے آپ نے کوئی ابھی تک معقول قدم نہیں اٹھایا۔ میرا اشارہ انعامی مقابلوں کی طرف ہے، آپ نے ابھی تک صرف انعامی کارڈوں کا انعام رکھا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کو چاہیے کہ اور کسی قسم کے انعامی مقابلے بھی شروع کریں۔ آپ کو اس طرح کرنے سے نونہالوں کی حوصلہ افزائی کرنے کا بہترین موقع مل جائے گا۔

کے۔ ایچ۔ یونس۔ سکھر

معلوماتی مضامین

جنوری ۱۹۶۵ء کے ہمدرد نونہال کا

ٹائٹل دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ معلوماتی مضامین میں "بجلی اور برقی سرکٹ"، "چیختے بھاگتے جنگل"، "پیراشوٹ"، "زلزلے کیوں آتے ہیں"، "ہم ٹیکس کیوں دیتے ہیں" بہت ہی پسند آئے۔ مجھے امید ہے کہ آئندہ بھی ہر شمارے میں چار پانچ معلوماتی مضامین ضرور شائع کر کے ہماری معلومات میں اضافہ کریں گے۔ جاگو، جگاؤ بہت ہی اچھا سلسلہ ہے۔

ابن حمید صاحب کا مضمون "میرا کیا نام ہے" بہت ہی پسند آیا۔ آپ نے لطیفے شائع کرنا کیوں بند کر دیے۔ نظموں میں "جھولا"، اور "محنت کر دیکھیے" قابل تعریف ہیں۔

یوسف گوڈیل شفا۔ کراچی

ترقی

امید ہے کہ مزاج گرامی خوش گوار ہوں گے۔ آج آپ کا رسالہ جنوری ۱۹۶۵ء موصول ہوا، پڑھ کر بہت خوشی حاصل ہوئی۔ اگر یہ رسالہ اسی طرح دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرتا رہا تو وہ دن دور نہیں جب یہ تمام پاکستان بھر میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ مختار۔ ڈیرہ اسمٰعیل خاں

ٹکٹوں کی خبریں

میں ہمدرد نونہال ہر ماہ کافی عرصہ سے پڑھ رہا ہوں اور ہر لحاظ سے مکمل پا رہا ہوں۔

اگر آپ ہمدرد نونہال کے "اخبار نونہال" میں ٹکٹوں کے بارے میں خبریں شائع کر دیا کریں تو اخبار نونہال میں چار چاند لگ جائیں، مثلاً ٹکٹوں کی نمائش کب اور کہاں ہوگی؟ ٹکٹ کب شائع ہوئے وغیرہ وغیرہ۔

کرامت علی۔ لائل پور

بادشاہ بلی بن گیا

اس دفعہ شمارہ نظر سے گزرا۔ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ویسے تو نونہال میں سب ہی کہانیاں اچھی ہیں، لیکن "سہارا"، "بونا کیتلی میں"، "چور کی سزا"، "چالیس گاؤں"، "چاند کی لڑکی" پسند آئی اور خاص طور پر "بادشاہ بلی بن گیا" بہت پسند آئی۔

منور پروین۔ کراچی

* * *

حلقۂ دوستی

سعید احمد کریمی -
عمر: ۱۳ سال - تعلیم: نہم
دل چسپیاں: کرکٹ - ٹینس کھیلنا
پتہ: معرفت - حامدہ جبیں - مکی پبلک اسکول
مکی - کھٹہ

سید رشید حسین جعفری - ملتان
عمر: ۱۳ سال تعلیم: دہم
دل چسپیاں: ہمدرد نونہال پڑھنا صحت افزا مقامات کی سیر کرنا -
پتہ: معرفت بہار جنرل اسٹور حرم گیٹ - ملتان

سید شاقب رضوی - لاہور
عمر: ۱۳ سال تعلیم: ہفتم
دل چسپیاں: تیرنا، ٹکٹ جمع کرنا، کھیلنا -
پتہ: معرفت ایم - ایس رضوی - ۴ لیک روڈ
اوپری منزل - لاہور

مرزا محمد مشتاق احمد
عمر: ۱۷ سال تعلیم: ایف اے
دل چسپیاں: قلمی دوستی - مضمون نویسی
پتہ: غازی پور - پوسٹ آفس سیالکوٹ
کینٹ

وقار احمد وقار - منٹگمری
عمر: ۱۴ سال تعلیم: نہم
دل چسپیاں: قلمی دوستی و کرکٹ کھیلنا
پتہ: معرفت ڈاکٹر مختار احمد ایم - او - سنٹرل جیل
منٹگمری -

رفیع احمد - حیدرآباد
عمر: ۱۵ سال تعلیم: فرسٹ ایئر
دل چسپیاں: قلمی دوستی - ٹکٹ جمع کرنا
پتہ: مکان نمبر ۷۷/۱۵ - ۲۱/بی
ایڈوانی لیس حیدرآباد - مغربی پاکستان

سید انور رضا - کراچی
عمر: ۱۲ سال تعلیم: ششم
دل چسپیاں: جانور پالنا - شکار کرنا -
پتہ: بی ۴ ۱/۲ ۱۲ ناظم آباد ۲ - کراچی ۱۸

ناصر پرویز - گوجرانوالہ
عمر: ۱۴ سال تعلیم: ہفتم
دل چسپیاں: قلمی دوستی - فٹ بال کھیلنا
پتہ: ناصر اینڈ برادرز مان سوتری مرچنٹس
گوجرانوالہ

ایم - اے - نواب - دیناج پور
عمر: ۱۵ سال تعلیم: دہم
دل چسپیاں: فوٹو، ٹکٹ جمع کرنا
پتہ: معرفت نواب منزل - نواب روڈ، پارتی پور
ضلع دیناج پور مشرقی پاکستان

کمال محمود خان - کراچی
عمر: ۹ سال تعلیم: پنجم
دل چسپیاں: قلمی دوستی - نونہال پڑھنا -
پتہ: ۱۲ - ایڈوانی برادرس بلڈنگ کیم چند شاہ
اسٹریٹ - نزد بلوچ پارک بندر روڈ - کراچی

بشیر ساقی - میانوالی
عمر: ۱۸ سال تعلیم: دہم
دل چسپیاں: قلمی دوستی - مطالعہ
پتہ: معرفت اصغر علی صاحب - ڈرلنگ سپروائزر -
بورنگ محکمہ زراعت - میانوالی

میاں دلاور حسین - سرگودھا
عمر: ۱۶ سال تعلیم: دہم
دل چسپیاں: قلمی دوستی، شاعری، مصوری
پتہ: ۲۷۲/اے اسٹیلائٹ ٹاؤن - سرگودھا

عبدالحنیف بروا - لاہور
عمر: ۱۱ سال تعلیم: ششم
دل چسپیاں: ٹکٹ جمع کرنا - کھیلنا
پتہ: ۲/۱۸۴ میوروڈ - دھرم پورہ - لاہور

شہباز - راولپنڈی
عمر: ۸ سال تعلیم: چہارم
دل چسپیاں: تصویریں جمع کرنا
پتہ: سٹیلائٹ ٹاؤن - بی - ۸۰۵ راولپنڈی
چوہدری محمد سعداللہ صاحب

طارق عزیز - لاہور
عمر: ۹ سال تعلیم: سوم
دل چسپیاں: فٹ بال کھیلنا
پتہ: وحدت کالونی ۲ - بی - لاہور ۱۸

خادم حسین - حیدرآباد
عمر: ۱۵ سال تعلیم: نہم
دل چسپیاں: قلمی دوستی، ٹکٹ جمع کرنا
پتہ: ۳۱۳ نواب منزل ہیرآباد - حیدرآباد -

عبدالستار عاصی - کوئٹہ
عمر: ۱۴ سال تعلیم: نہم
دل چسپیاں: قلمی دوستی، ٹکٹ جمع کرنا
پتہ: عبدالستار عاصی - کنگ روڈ -
کوارٹر ۲۸ - کوئٹہ چھاؤنی۔

زبیدہ بی۔ زلفی۔ سیالکوٹ
عمر: ۱۵ سال تعلیم: نہم
دل چسپیاں: قلمی دوستی۔ کھیلنا۔
پتہ: ہاؤس نمبر ۳۳۳/۱۷ امیانہ پورہ سیالکوٹ ۲

سید اقبال احسن۔ پشاور
عمر: ۱۵ سال تعلیم: نہم
دل چسپیاں: ٹکٹ، سکّے جمع کرنا۔
پتہ: وینو اسٹریٹ وحید منزل نوتھیہ۔ پشاور کینٹ

محمد بدر عالم۔ چاٹگام
عمر: ۱۳ سال تعلیم: ہفتم
دل چسپیاں: قلمی دوستی۔ کرکٹ کھیلنا
پتہ: کے۔پی۔ایم ہائی اسکول پوسٹ چندرگھونہ ضلع چاٹگام

عبدالرشید راشد۔ ڈیرہ غازی خان
عمر: ۱۷ سال تعلیم: ایف ایس سی
دل چسپیاں: قلمی دوستی
پتہ: معرفت ظفر کلاتھ ہاؤس صدر بازار ڈیرہ غازی خاں

محمد ابراہیم۔ چٹگام
عمر: ۱۳ سال تعلیم: ہفتم
دل چسپیاں: قلمی دوستی۔ کرکٹ کھیلنا
پتہ: کے۔پی۔ایم۔ہائی اسکول پوسٹ چندرگھونہ ضلع چٹگام۔

سید انور علی۔ حیدرآباد
عمر: ۱۶ سال تعلیم: دہم
دل چسپیاں: قلمی دوستی۔ ورزش کرنا
پتہ: سیفی اسٹیشنری مارٹ۔ لجپت روڈ۔ حیدرآباد

سید اقبال حسین۔ کراچی
عمر: ۱۵ سال تعلیم: نہم
دل چسپیاں: قلمی دوستی۔ کرکٹ کھیلنا
پتہ: جی ۵۴-۵۵۔ ڈینجر روڈ۔ چاکیواڑہ کراچی ۲

آگسٹین جے۔ اوکاڑہ
عمر: ۱۸ سال تعلیم: دہم
دل چسپیاں: مطالعہ، شاعری
پتہ: مشتاق منزل کوٹ امیر علی شاہ اوکاڑہ

سید محمد معین اظہر۔ کراچی
عمر: ۱۸ سال تعلیم: دہم
دل چسپیاں: قلمی دوستی۔ فوٹو کھینچنا
پتہ: ۱/۱ ولایت آباد منگھو پیر روڈ کراچی ۱۶

ایم۔ ایچ۔ دلدار چوہدری لاہور
عمر: ۱۳ سال تعلیم: ہفتم
دل چسپیاں: نونہال پڑھنا۔ مطالعہ
پتہ: کشمیر ہائی اسکول شالیمار ٹاؤن لاہور

محمد اشرف۔ شلہاد
عمر: ۱۵ سال تعلیم: ہشتم
دل چسپیاں: کرکٹ۔ ٹکٹ جمع کرنا۔

پتہ: ڈی۔سی۔ ہائی اسکول۔ شلہاد

سید ضیاء الرحمٰن ضیا۔ پٹنہ
عمر: ۱۷ سال۔ تعلیم: دہم
دل چسپیاں: قلمی دوستی۔ شاعری
پتہ: محلہ صادق پور۔ ڈاک خانہ گلزار باغ ضلع پٹنہ ۷ (انڈیا)

محمد ہارون۔ حیدرآباد
عمر: ۱۲ سال تعلیم: پنجم
دل چسپیاں: ٹکٹ جمع کرنا۔ مطالعہ
پتہ: کالوجی نور محمد سادی بازار آرموانی لین حیدرآباد

شمیم اختر۔ میمن سنگھ
عمر: ۱۴ سال تعلیم: دہم
دل چسپیاں: افسانہ نگاری۔ قلمی دوستی
پتہ: ریلوے کوارٹر نمبر ۱۲۳/بی/ٹی۔ نیو کالونی میمن سنگھ

محمد اختر طارق۔ بہاولپور
عمر: ۱۶ سال۔ تعلیم: نہم
دل چسپیاں: قلمی دوستی
پتہ: اختر منزل محلہ چاہ فتح خان۔ بہاول پور

انجم العارفین۔ ڈھاکہ
عمر: ۱۲ سال تعلیم: ششم
دل چسپیاں: قلمی دوستی۔ فٹ بال
پتہ: عابدین ہاؤس گراؤنڈ۔ فلور ۱۵۶ مکرائیل روڈ۔ ڈھاکہ

فارم حلقۂ دوستی

نام: ....
عمر: ....
تعلیم: ....
دل چسپیاں: ....
پتہ: ....
....

ان الفاظ کے معنی کیا ہیں؟

افراط : زیادتی، کثرت
پٹے : جوتیوں کا وہ چمڑا جس پر روغن لگا کر گھوٹ دیتے ہیں
تاریک : سیاہ، کالا، اندھیرا
جست : کود، پھاند
جلاوطن : شہر بدر کرنا، وہ آدمی جو شہر سے نکالا گیا ہو
چشم زدن : لمحہ بھر، پلک مارنا
حواس باختہ : گھبرایا ہوا، بے اوسان
خراج : زمین کا ٹیکس
خوش اسلوبی : اچھی طرح، سلیقہ کے ساتھ
خوش گوار : خوش ذائقہ، مزے دار
خوش نودی : رضامندی، خوشی
دل کش : دل کو لبھانے والا، حسین پسندیدہ
دھارا : دریا کے پانی کی جاری ہونے کی جگہ
دھان : چھلکوں سمیت چاول
رانپی : چمڑا کاٹنے اور چھیل کر صاف کرنے کا اوزار

رائیگاں : بے کار، مفت، بے قیم حاصل نہ ہونا
رنگ فق ہونا : کسی خوف یا حیرت سے چہر کا رنگ بدل جانا
سرغنہ : سردار، لیڈر
شاہ بلوط : ایک قسم کا درخت
صلہ : انعام، بدلہ، بخشش
ضامن : ذمہ دار، بیچ میں پڑ
طاب : خوشبو
طرز : طریقہ، قاعدہ
فلک بوس : بہت اونچا
قاش : پھانک
قالب : سانچہ
کہرام : ماتم
گلشن : باغ
لاج : عزت، شرم
ماجرا : قصہ، سرگزشت
متنبہ : تنبیہ کرنا
مجال : طاقت
منادی کرنا : اعلان کرنا

حکیم حافظ محمد سعید ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے زین پیکیجنگ انڈسٹریز کراچی میں چھپوا کر ادارۂ مطبوعات ہمدرد ناظم آباد کراچی ۱۸ سے شائع